ایوانِ نثر

ناشر

موتی لال بنارسی داس - پٹنہ ۴

ایوان نثر

مرتبہ

پروفیسر حافظ عبدالمنان
لکچرر اردو برنگھہ کالج
بھاگلپور یونیورسٹی

اور

پروفیسر محمد شبیر
لکچرر اردو ایم۔جے۔کے کالج، بتیا
بہار یونیورسٹی

ناشر

ایوان اردو۔ پٹنہ ۴

قیمت عہ/ ۱۲ر

Rs 2.75

اشر:-

ایوان اردو پٹنہ ۴

ول ایجنٹ:-

موتی لال بنارسی داس پٹنہ ۴

مطبوعہ:- دی آزاد پریس سبزی باغ پٹنہ ۴

فہرست

کفن

(۱)

جھونپڑے کے دروازے پر باپ اور بیٹے دونوں ایک بجھے ہوئے الاؤ
کے سامنے خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ اور اندر بیٹے کی جوان بیوی بدھیا
دردِ زہ سے پچھاڑیں کھا رہی تھی اور رہ رہ کر اس کے منہ سے ایسی
دل خراش صدا نکلتی تھی کہ دونوں کلیجہ تھام لیتے تھے۔ جاڑوں کی رات
تھی، فضا سناٹے میں غرق۔ سارا گاؤں تاریکی میں جذب ہو گیا تھا۔

گھیسو نے کہا "معلوم ہوتا ہے بچے گی نہیں۔ سارا دن تڑپتے ہو گیا۔
جا دیکھ تو آ۔"

مادھو دردناک لہجے میں بولا "مرنا ہے تو جلدی مر کیوں نہیں جاتی۔
دیکھ کر کیا آؤں؟"

"تو بڑا بے درد ہے بے! سال بھر جس کے ساتھ جندگانی کا دکھ
بھوگا اسی کے ساتھ اتنی بے وپھائی؟"

"تو مجھ سے تو اس کا تڑپنا اور ہاتھ پاؤں پٹکنا نہیں دیکھا جاتا۔"

چماروں کا کنبہ تھا اور سارے گاؤں میں بدنام۔ گھیسو ایک دن کام

کرتا تو تین دن آرام۔ مادھو اتنا کام چور تھا کہ گھنٹہ بھر کام کرتا تو گھنٹہ بھر چلم پیتا۔ اس لئے انہیں کوئی رکھتا ہی نہ تھا۔ گھر میں مٹھی بھر اناج موجود ہو تو ان کے لئے کام کرنے کی قسم تھی۔ جب دو ایک فاقے ہو جاتے تو گھیسو درختوں پر چڑھ کر لکڑیاں توڑ لاتا اور مادھو بازار میں بیچ آتا اور جب تک وہ پیسے رہتے دونوں ادھر اُدھر مارے مارے پھرتے۔ جب فاقے کی نوبت آجاتی تو پھر لکڑیاں توڑتے یا کوئی مزدوری تلاش کرتے۔ گاؤں میں کام کی کمی نہ تھی۔ کاشتکاروں کا گاؤں تھا۔ محنتی آدمی کے لئے پچاس کام تھے۔ مگر ان دونوں کو لوگ اسی وقت بلاتے جب دو آدمیوں سے ایک ایک کام پاکر بھی قناعت کر لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوتا۔ کاش دونوں سادھو ہوتے تو انہیں قناعت اور توکل کے لئے ضبط نفس کی مطلق ضرورت نہ ہوتی۔ یہ ان کی خلقی صفت تھی۔ عجیب زندگی تھی انکی! گھر میں مٹی کے دو چار برتنوں کے سوا کوئی اثاثہ نہیں۔ پھٹے چیتھڑوں سے اپنی عُریانی کو ڈھانکے ہوئے، دُنیا کے فکروں سے آزاد، قرض سے لدے ہوئے۔ گالیاں بھی کھاتے تھے مگر کوئی غم نہیں۔ مسکین اتنے کہ وصولی کی مطلق اُمید نہ ہونے پر بھی لوگ انہیں کچھ نہ کچھ قرض دے دیتے تھے۔ مٹر یا آلو کی فصل میں کھیتوں سے مٹر یا آلو اکھاڑ لاتے اور بھون بھون کر کھاتے۔ یا دس پانچ اوکھ توڑ لاتے اور راتوں کو چوستے۔ گھیسو نے اسی زاہدانہ انداز سے ساٹھ سال کی عمر کاٹ دی اور مادھو بھی سعادت مند بیٹے کی طرح باپ کے نقش قدم پر چل رہا تھا، بلکہ اس کا

نام اور بھی روشن کر رہا تھا۔ اس وقت بھی دونوں الاؤ کے سامنے بیٹھے آلو بھون رہے تھے جو کسی کے کھیت سے کھود لائے تھے۔ گھیسو کی بیوی کا تو مدت ہوئی انتقال ہو گیا تھا، مادھو کی شادی پچھلے سال ہوئی تھی۔ جب سے یہ عورت آئی تھی اس نے اس خاندان میں تمدن کی بنیاد ڈالی تھی۔ پسائی کر کے، گھاس چھیل کر وہ سیر بھر آٹے کا انتظام بھی کر لیتی تھی اور ان دونوں بے غیرتوں کا دوزخ بھرتی رہتی تھی۔ جب سے وہ آئی یہ دونوں اور بھی آرام طلب اور آلسی ہو گئے تھے بلکہ کچھ اکڑنے بھی لگے تھے۔ کوئی کام کرنے کو بلاتا تو بے نیازی کی شان سے دوگنی مزدوری مانگتے۔ وہی عورت آج صبح سے دردِ زہ مر رہی تھی اور یہ دونوں شاید اسی انتظار میں تھے کہ یہ مر جائے تو آرام سے سوئیں۔

گھیسو نے آلو نکال کر چھیلتے ہوئے کہا۔ "جا دیکھ تو کیا حالت ہے اس کی۔ چڑیل کا پھساد ہوگا اور کیا یہاں تو اوجھا بھی ایک روپیہ مانگتا ہے، کس کے گھر سے آئے؟"

مادھو کو اندیشہ تھا کہ وہ کوٹھری میں گیا تو گھیسو آلوؤں کا بڑا حصہ صاف کر دے گا، بولا "مجھے وہاں ڈر لگتا ہے۔"

"ڈر کس بات کا ہے، میں تو یہاں ہوں ہی۔"

"تو تم ہی جا کر دیکھو نا۔"

"میری عورت جب مری تھی تو میں تین دن اس کے پاس سے ہلا بھی نہیں اور پھر مجھ سے لجائے گی نہیں۔ کبھی اس کا منہ نہیں دیکھا، آج اس کا

اُگھرا ہوا بدن دیکھوں۔ اسے تن کی سُدھ بھی تو نہ ہوگی۔ مجھے دیکھ لے گی تو کھل کر ہاتھ پاؤں بھی نہ پٹک سکے گی۔

"میں سوچتا ہوں کوئی بال بچّہ ہو گیا تو کیا ہوگا۔ سونٹھ، گڑ، تیل کچھ بھی تو نہیں ہے گھر میں۔"

"سب کچھ آ جائے گا۔ بھگوان بچّہ دیں تو۔ جو لوگ ابھی ایک پیسہ نہیں دے رہے ہیں وہی تب بُلا کر دیں گے۔ میرے تو لڑکے ہوئے، گھر میں کبھی کچھ نہ تھا مگر اسی طرح ہر بار کام چل گیا۔"

جس سماج میں رات دن کام کرنے والوں کی حالت ان کی حالت سے کچھ بہت اچھّی نہ تھی اور کسانوں کے مقابلے میں وہ لوگ جو کسانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اُٹھانا جانتے تھے کہیں زیادہ فارغ البال تھے۔ وہاں اس قسم کی ذہنیت کا پیدا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ ہم تو کہیں گے گھیسو کسانوں کے مقابلے میں زیادہ باریک بیں تھا اور کسانوں کی تہی دماغ جمیت میں شامل ہونے کے بدلے شاطروں کی فتنہ پرداز جماعت میں شامل ہو گیا تھا۔ ہاں اس میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ شاطروں کے آئین و ادب کی پابندی بھی کرتا۔ اس لئے یہاں اس کی جماعت کے اور لوگ گاؤں کے سرغنہ اور مُکھیا بنے ہوئے تھے اس پر سارا گاؤں انگشت نمائی کرتا تھا۔ پھر بھی اسے یہ تسکین تو تھی ہی کہ اگر وہ خستہ حال ہے تو کم از کم اسے کسانوں کی سی جگر توڑ محنت تو نہیں کرنی پڑتی اور اس کی سادگی اور بے زبانی سے دوسرے بے جا فائدہ تو نہیں اُٹھاتے۔

دونوں آلو نکال نکال کر جلتے جلتے کھانے لگے۔ کل سے کچھ نہیں کھایا تھا اتنا صبر نہ تھا کہ انہیں ٹھنڈا ہو جانے دیں۔ کئی بار دونوں کی زبانیں جل گئیں چھل جانے پر آلو کا بیرونی حصّہ تو بہت زیادہ گرم نہ معلوم ہوتا لیکن دانتوں کے تلے پڑتے ہی اندر کا حصّہ زبان اور حلق اور تالو کو جلا دیتا تھا۔ اور اس انگارے کو منہ میں رکھنے سے زیادہ خیریت اسی میں تھی کہ وہ اندر پہنچ جائے وہاں اس کے ٹھنڈا کرنے کے لئے کافی سامان تھا اس لئے دونوں جلد جلد نگل جاتے۔ حالانکہ اس کوشش میں ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔

گھیسو کو اس وقت ٹھاکر کی برات یاد آئی جس میں بیس سال پہلے وہ گیا تھا۔ اس دعوت میں اسے جو سیری نصیب ہوئی تھی وہ اس کی زندگی میں ایک یادگار واقعہ تھی اور آج بھی اس کی یاد تازہ تھی۔ بولا "وہ بھوج نہیں بھولتا۔ تب سے پھر اس طرح کا کھانا اور بھر پیٹ نہیں ملا۔ لڑکی والوں نے سب کو پوڑیاں کھلائی تھیں۔ سب کو ——— چھوٹے بڑے سب نے پوڑیاں کھائیں اور اصلی گھی کی چٹنی، رائتہ، تین طرح کے سوکھے ساگ، ایک رسے دار ترکاری۔ دہی، چٹنی، مٹھائی۔ اب کیا بتاؤں کہ اس بھوج میں کتنا سواد ملا۔ کوئی روک نہیں تھی۔ جو چیز چاہو مانگو اور جتنا چاہو کھاؤ۔ لوگوں نے تو ایسا کھایا ایسا کھایا کہ کسی سے پانی نہ پیا گیا۔ مگر پروسنے والے ہیں کہ سامنے گرم گرم گول گول مہکتی کچوریاں ڈالے دیتے ہیں۔ منع کرتے ہیں کہ نہیں چاہیے، پتل کو ہاتھ سے روکے ہوئے ہیں مگر وہ ہیں کہ دیئے جاتے

ہیں اور جب سب نے مُنہ دھولیا تو ایک ایک بیڑا پان بھی ملا۔ مگر مجھے پان لینے کی کہاں سُدھ تھی۔ کھڑا نہ ہوا جاتا تھا۔ چٹ پٹ کر جا کر اپنے کمبل پر لیٹ گیا۔ ایسا دریا دل تھا وہ ٹھاکر۔"

مادھو نے ان تکلفات کا مزہ لیتے ہوئے کہا۔" اب ہمیں کوئی ایسا بھوج کھلاتا۔"

" اب کوئی کیا کھلائے گا۔ وہ جمانا دوسرا تھا۔ اب تو سب کو کپھایت سوجھی ہے۔"

"تم نے بیس پوڑیاں کھائی ہوں گی۔"

" بیس سے جیادہ کھائی تھیں۔"

" میں پچاس کھا جاتا۔"

" پچاس سے کم میں نے بھی نہ کھائی ہوں گی۔ اچھا پٹھا تھا۔ تو اس کا آدھا بھی نہیں ہے۔"

آلو کھا کر دونوں نے پانی پیا اور وہیں الاؤ کے سامنے اپنی دھوتیاں اوڑھ کر پاؤں پیٹ میں ڈالے سو رہے جیسے دو بڑے اژدر گینڈلیاں مارے پڑے ہوں۔ اور بڑھیا ابھی تک کراہ رہی تھی۔

(۲)

صُبح کو مادھو نے کوٹھری میں جا کر دیکھا تو اس کی بیوی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اس کے مُنہ پر مکھیاں بھنک رہی تھیں۔ سارا جسم خاک میں لت پت ہو رہا تھا۔ اس کے پیٹ میں بچہ مر گیا تھا۔

مادھو بھاگا ہوا گھیسو کے پاس آیا۔ پھر دونوں زور زور سے ہائے ہائے کرنے اور چھاتی پیٹنے لگے۔ پڑوس والوں نے یہ آہ وزاری سُنی تو دوڑے ہوئے آئے اور رسم قدیم کے مطابق غم زدوں کی تشفی کرنے لگے۔

مگر زیادہ رونے دھونے کا موقع نہ تھا۔ کفن کی اور لکڑی کی فکر کرنی تھی۔ گھر میں تو پیسہ اسی طرح غائب تھا جیسے چیل کے گھونسلے میں ماس۔

باپ بیٹے روتے ہوئے گاؤں کے زمیندار کے پاس گئے۔ وہ ان دونوں کی صورت سے نفرت کرتے تھے۔ کئی بار انہیں اپنے ہاتھوں پیٹ چکے تھے۔ چوری کی علت میں، وعدہ پر کام نہ آنے کی علت میں۔ پوچھا "کیا ہے بے گھیسوا۔ روتا کیوں ہے؟ اب تو تیری صورت ہی نظر نہیں آتی۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ تم اس گاؤں میں رہنا نہیں چاہتے"۔

گھیسوا نے زمین پر سر رکھ کر، آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا "سرکار بڑی بپت میں ہوں، مادھو کی گھر والی رات گزر گئی۔ دن بھر تڑپتی رہی سرکار۔ آدھی رات تک ہم دونوں اس کے سرہانے بیٹھے رہے۔ دوا دارو جو کچھ ہو سکا سب کیا۔ مگر وہ ہمیں دگا دے گئی۔ اب کوئی ایک روٹی دینے والا نہیں رہا مالک، تباہ ہو گئے، گھر اُجڑ گیا۔ آپ کا گلام ہوں، اب آپ کے سوا اس کی مٹی کون پار لگائے گا، ہمارے ہاتھ میں تو جو کچھ تھا وہ سب دوا دارو میں اُٹھ گیا، سرکار ہی کی دیا ہو گی تو اس کی مٹی اُٹھے گی۔ آپ کے سوا اور کس کے دوار پر جاؤں؟"

زمیندار صاحب رحم دل آدمی تھے مگر گھیسو پر رحم کرنا کالے کمبل کو

رنگ پڑھاتا تھا۔ جی میں تو آیا کہہ دیں "چل دور ہو یہاں سے لاش گھر میں رکھ سڑا۔ یوں تو بلانے سے نہیں آتا آج جب غرض پڑی تو آکر خوشامد کر رہا ہے، حرام خور کہیں کا بدمعاش"، مگر یہ غصہ یا انتقام کا موقعہ نہیں تھا، طوعاً وکرہاً دو روپے نکال کر پھینک دیئے مگر تشفی کا ایک کلمہ بھی منہ سے نہ نکالا، اس کی طرف تاکا تک نہیں، گویا سر کا بوجھ اتارا ہو۔

جب زمیندار صاحب نے دو روپے دیئے تو گاؤں کے بنئے مہاجنوں کو انکار کی جرأت کیونکر ہوتی۔ گھیسو زمیندار کے نام کا ڈھنڈورا پیٹنا جانتا تھا۔ کسی نے دو آنے دیئے، کسی نے چار آنے، ایک گھنٹے میں گھیسو کے پاس پانچ روپے کی معقول رقم جمع ہو گئی، کسی نے غلہ دے دیا اور کسی نے لکڑی، اور دوپہر کو گھیسو اور مادھو بازار سے کفن لانے چلے، ادھر لوگ بانس وانس کاٹنے لگے۔

گاؤں کی رقیق القلب عورتیں لاش کو آکر دیکھتی تھیں اور اس کی بے بسی پر دو بوند آنسو گرا کر چلی جاتی تھیں۔

(۳)

بازار پہونچ کر گھیسو بولا "لکڑی تو اسے جلانے بھر کو مل گئی ہے، کیوں مادھو!"

مادھو بولا "ہاں لکڑی تو بہت ہے اب کپھن چاہیئے"

"تو کوئی ہلکا سا کپھن لے لیں"

"ہاں اور کیا۔ لاس اٹھتے اٹھتے رات ہو جائے گی، رات کو کپھن کون

دیکھتا ہے ؟

کیسا بُرا رواج ہے کہ جسے جیتے جی تن ڈھانکنے کو چیتھڑا بھی نہ ملے اسے مرنے پر نیا کپھن چاہیے۔"

" کپھن لاس کے ساتھ جل ہی تو جاتا ہے۔"

" اور کیا رکھا ہے، یہی پانچ روپے ملتے تو کچھ دوا دارو کرتے۔"

دونوں ایک دوسرے کے دل کا ماجرا معنوی طور پر سمجھ رہے تھے۔ بازار میں ادھر ادھر گھومتے رہے۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ دونوں اتفاق سے یا عمداً ایک شراب خانے کے سامنے آپہنچے اور کسی طے شدہ فیصلے کے مطابق اندر گئے۔ وہاں ذرا دیر تک دونوں تذبذب کی حالت میں کھڑے رہے، پھر گھیسو نے ایک بوتل شراب لی کچھ گزک، اور دونوں برآمدہ میں بیٹھ کر پینے لگے۔

کئی کُجیاں پیہم پینے کے بعد دونوں سرور میں آگئے۔

گھیسو بولا " کپھن لگانے سے کیا ملتا۔ آخر جل ہی تو جاتا کچھ بہو کے ساتھ تو نہ جاتا۔"

مادھو آسمان کی طرف دیکھ کر بولا۔ گویا فرشتوں کو اپنی معصومیت کا یقین دلا رہا ہو " دنیا کا دستور ہے۔ یہیں لوگ بامنوں کو ہجاروں روپے کیوں دے دیتے ہیں، کون دیکھتا ہے پرلوک میں ملتا ہے یا نہیں۔"

" بڑے آدمیوں کے پاس دھن ہے پھونکیں۔ ہمارے پاس پھونکنے کو کیا ہے۔"

" لیکن لوگوں کو جواب کیا دو گے ؟ لوگ پوچھیں گے نہیں کپھن کہاں ہے ؟

گھیسو ہنسا "کہہ دیں گے روپے کمر سے گر گئے، بہت ڈھونڈا ملے نہیں۔"

مادھو بھی ہنسا۔ اس غیر متوقع خوش نصیبی پر، قدرت کو اس طرح شکست دینے پر، بولا "بڑی اچھی تھی بچاری، مری بھی تو خوب کھلا پلا کر۔"

آدھی بوتل سے زیادہ ختم ہو گئی۔ گھیسو نے دو سیر پوڑیاں منگوائیں۔ گوشت اور سالن اور چٹ پٹی کلیجیاں اور تلی ہوئی مچھلیاں۔ شراب خانے کے سامنے ہی دوکان تھی۔ مادھو لپک کر دو پتلوں میں ساری چیزیں لے آیا۔ پورے ڈیڑھ روپے خرچ ہو گئے۔ صرف تھوڑے سے پیسے بچ رہے۔

دونوں اس وقت اس شان سے بیٹھے ہوئے پوریاں کھا رہے تھے جیسے جنگل میں کوئی شیر اپنا شکار اڑا رہا ہو۔ نہ جواب دہی کا خوف تھا، نہ بدنامی کی فکر۔ ضعف کے ان مراحل کو انہوں نے بہت پہلے طے کر لیا تھا۔ گھیسو فلسفیانہ انداز سے بولا "ہماری آتما پرسن ہو رہی ہے تو کیا اسے پُن نہ ہو گا؟"

مادھو نے فرق عقیدت جھکا کر تصدیق کی "جرور سے جرور ہو گا۔ بھگوان تم انتر جامی (علیم) ہو۔ اسے بیکنٹھ میں لے جانا۔ ہم دونوں ہردے سے دعا دے رہے ہیں۔ آج جو بھوجن ملا وہ کبھی عمر بھر نہ ملا تھا۔"

ایک لمحہ کے بعد مادھو کے دل میں ایک تشویش پیدا ہوئی "کیوں دادا ہم لوگ بھی تو ایک نہ ایک دن وہاں جائیں گے ہی۔"

گھیسو نے اس طفلانہ سوال کا کوئی جواب نہ دیا، مادھو کی طرف پُر ملامت انداز سے دیکھا۔

"جو وہاں ہم لوگوں سے پوچھے گی کہ تم نے ہمیں کپھن کیوں نہیں دیا تو کیا کہو گے؟"

"کہیں گے تمہارا سر"

"پوچھے گی تو ضرور"

"تو کیسے جانتا ہے اسے کپھن نہ ملے گا۔ تو مجھے ایسا گدھا سمجھتا ہے۔ میں ساٹھ سال دُنیا میں کیا گھاس کھودتا رہا ہوں۔ اس کو کپھن ملے گا اور اس سے بہت اچھا ملے گا جو ہم دیتے"

مادھو کو یقین نہ آیا۔ بولا "کون دے گا؟ روپے تو تم نے چٹ کر دیئے"

گھیسو تیز ہو گیا "میں کہتا ہوں اسے کپھن ملے گا تو مانتا کیوں نہیں؟"

"کون دے گا بتاتے کیوں نہیں"

"وہی لوگ دیں گے جنہوں نے اب کی دیا۔ ہاں وہ روپے ہمارے ہاتھ نہ آئیں گے اور اگر کسی طرح آ جائیں تو پھر ہم اسی طرح یہاں بیٹھے پئیں گے اور کپھن تیسری بار ملے گا"

جوں جوں اندھیرا بڑھتا تھا اور ستاروں کی چمک تیز ہوتی تھی مے خانے کی رونق بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ کوئی گاتا تھا، کوئی بہکتا تھا، کوئی اپنے رفیق کے گلے لپٹا جاتا تھا، کوئی اپنے دوست کے مُنہ میں ساغر لگائے دیتا تھا۔ وہاں کی فضا میں سرور تھا، ہوا میں نشہ، کتنے تو چلّو میں اُلّو ہو جاتے ہیں یہاں آتے تھے صرف خود فراموشی کا مزہ لینے کے لئے۔ شراب سے زیادہ یہاں کی ہوا سے مسرور ہوتے تھے۔ زیست کی بلا یہاں کھینچ لاتی تھی اور کچھ دیر کے لئے وہ بھول جاتے تھے کہ وہ زندہ ہیں یا مُردہ ہیں، یا زندہ درگور ہیں۔

اور یہ دونوں باپ بیٹے اب بھی مزے لے لے کر چسکیاں لے رہے تھے۔

سب کی نگاہیں ان کی طرف جمی ہوئی تھیں۔ کتنے خوش نصیب ہیں دونوں۔ پوری بوتل بیچ میں ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر مادھو نے پوریوں کا پتل اُٹھا کر ایک بھکاری کو دے دیا۔ جو کھڑا ان کی طرف گرسنہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور "دینے" کے غرور، ولولہ اور مسرت کا اپنی زندگی میں پہلی بار احساس کیا۔

گھیسو نے کہا "لے جا۔ کھوب کھا اور آسرباد دے۔ جس کی کمائی ہے وہ تو مر گئی، مگر تیرا آسرباد اسے جرور پہنچ جائے گا۔ روئیں روئیں سے آسرباد دے۔ بڑی گاڑھی کمائی کے پیسے ہیں۔"

مادھو نے پھر آسمان کی طرف دیکھ کر کہا "بیکنٹھ میں جائے گی دادا بیکنٹھ کی رانی بنے گی۔"

گھیسو کھڑا ہو گیا اور جیسے مسرت کی لہروں میں تیرتا ہوا۔ بولا "ہاں بیٹا، بیکنٹھ میں جائے گی۔ کسی کو ستایا نہیں، کسی کو دبایا نہیں۔ مرتے وقت ہماری جندگی کی سب سے بڑی لالسا پوری کر گئی۔ وہ نہ بیکنٹھ میں جائے گی تو کیا یہ موٹے موٹے لوگ جائیں گے جو گریبوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹتے ہیں اور اپنے پاپ کو دھونے کے لئے گنگا میں جاتے ہیں اور مندر میں جل چڑھاتے ہیں۔"

یہ خوش اعتقادی کا رنگ بھی بدلا۔ تلون نشہ کی خاصیت ہے۔ یاس اور غم کا دورہ ہوا۔ مادھو بولا "مگر دادا بچاری نے جندگی میں بڑا دکھ بھوگا۔ مری بھی کتنا دکھ جھیل کر۔" وہ آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کر رونے لگا۔

گھیسو نے سمجھایا "کیوں روتا ہے بیٹا، خوش ہو کہ وہ مایا جال سے مکت ہو گئی، جنجال سے چھوٹ گئی۔ بڑی بھاگوان تھی جو اتنی جلدی مایا موہ کے بندھن توڑ دئے۔"

اور دونوں وہیں کھڑے ہو کر گانے لگے :-

ٹھگنی کیوں نیناں جھمکاوے ٹھگنی

سارا مے خانہ محو تماشا تھا اور یہ دونوں میکش محویت کے عالم میں گائے جاتے تھے۔ پھر دونوں ناچنے لگے، اُچھلے بھی، کودے بھی، گرے بھی، مٹکے بھی، بھاؤ بھی بتائے اور آخر نشہ سے بدمست ہو کر وہیں گر پڑے۔

صنوبر کے سائے

میں جب سے ان پہاڑی علاقوں میں آئی تھی "نہر روحناک" کی رعنائیوں کا ذکر ہر خاص و عام سے سُنتی تھی، لوگ کہتے اس صنوبر کے سایوں سے ڈھنپے ہوئے کناروں پر سہانے خوابوں کی رومان جھلملاتی ہے۔ پہاڑی خانہ بدوشوں کا بیان تھا کہ نامعلوم پہاڑوں کی بلندیوں نے ایک مقام پر آسمان کے نیل میں شگاف کر رکھا ہے۔ اور روحناک کی نیلی دھار وہیں سے اُترتی اور کوہساروں میں سے ہرتی پھرتی اس وادی میں ایک ندی بن کر آ نکلتی ہے۔

بھلا آپ غور کیجئے۔ ان رومانی فقروں کو سُن کر مجھ جیسی سیر و سیاحت کی دلدادہ سے کب نچلا بیٹھا جا سکتا تھا؟

ایک دن میں نے اپنی محبوب سہیلی جسونتی سے مچل کر کہا "جسونتی! ہمیں یہاں آئے دو ہفتے گذر چکے، مگر ہم نے نہر روحناک کی سیر تک نہیں کی۔ تم پسند کرو تو آج شام کشتی کی سیر کو چلیں"

جسونتی کو آپ جانتے ہیں۔ سفید چہرے والی سلیم الطبع لڑکی ہے۔ اس سفر میں میں اُسے اپنے ساتھ تقریباً کھینچ کر لائی تھی۔

اُس نے مسکرا کر کہا۔ "جیسی تمہاری مرضی روحی۔ لیکن پانی سے مجھے ڈر لگتا ہے۔"

اسی وقت جسوتی کی ایک محبوب حبشی نژاد خانہ زاد نے کہا۔ "خاتون میں نے سنا ہے ساحل رو خناک پر ایک بہت مشّاق سو سال کا بوڑھا ملّاح رہتا ہے، اس کی کشتی کبھی لہروں پر نہیں ڈگمگاتی۔ اگر آپ اجازت دیں تو اسی ملّاح کی کشتی کرائے پر لی جائے۔"

میں نے بے پروائی سے کہا۔ "کوئی ملّاح اور کوئی کشتی ہو۔"

جسوتی نے کہا۔ "سو سال کا ملّاح خاک کشتی چلاتا ہو گا۔"

خانہ زاد نے کہا۔ "خاتون! سُنا ہے وہ ستر سال سے کشتی بانی کرتا ہے۔ اور آج تک اس کی کشتی کو کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔"

غرض اسی وقت ہم نے اُسے کشتی کرایہ پر لینے اور شام کی چائے کا انتظام کشتی ہی میں کرنے کے لئے روانہ کر دیا۔

(۲)

جب ہم دونوں اس مقام پر پہنچے۔ جہاں سے سیّاح رو خناک کی سیر کے لئے پانی کا سفر شروع کرتے ہیں۔ تو ہم نے دیکھا۔ کہ ایک سُرخ اور نیلے رنگ کا مرصع شکارا ہمارے انتظار میں ہے۔ اس کے موتیوں کے کانپتے ہوئے پردوں میں سے ایرانی قالین کے پاروں پر رکھے ہوئے خوش وضع اور خوش قطع تکیے دعوتِ استراحت دے رہے تھے۔

میں نے مسکرا کر جسوتی سے کہا۔ یہ "خلیفۂ بغداد کا شراب تفریح معلوم ہوتا ہے۔"

اندر آرام سے نیم دراز ہونے کے بعد ہم نے مڑ کر کشتی چلانے والے کو دیکھا۔ ایک پیر صد سالہ کشتی کے پرلے سرے پر چپّو ہاتھ میں لئے بیٹھا تھا۔ اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر سفید داڑھی کے بال ہلکی ہلکی ہوا سے کانپ رہے تھے۔ پرانی آنکھوں میں زندگی کی تابانی و درخشانی نہ تھی بلکہ —— جیسے ایک دھند میں ماضی کی حسرتِ دیدار جھلکتی نظر آ رہی تھی۔

حبشی خانہ زاد نے چائے تیار کر رکھی تھی۔ ہم گرم گرم چائے کے خوشگوار گھونٹ حلق سے اتارتے دھیرے دھیرے رو خناک کی طرف جا رہے تھے۔ جبکہ نیل پر غروبِ آفتاب مچل مچل کر شہاب پاشی کر رہا تھا۔

منظر بتدریج وارفتہ سا ہوا جا رہا تھا۔ ہواؤں میں نکہت بڑھ رہی تھی پانی کی چھوٹی لہروں کی آواز پر شبہ ہوتا تھا کہ جیسے دور کہیں خواب کے پردے میں پانی برس رہا ہو، فطرت اپنی بے ساختہ رعنائیوں کا دامن پھیلائے ہمارے سامنے تھی۔ ایک تصویر جس میں ڈھلتے ہوئے سورج کا ہر لمحہ نئے انداز سے رنگین موقلم کی شعبدہ بازیاں دکھا رہا تھا۔ اے اللہ! سچ مچ وہ خواب کی سرزمین تھی، رومان کا جزیرہ تھا۔

سیدھے اور تنا ور صنوبر جیسے دم بخود کھڑے تھے۔ اور ان کے درمیان سے کہیں پھولوں سے ڈھنپی ہوئی ڈھلوانیں نظر آئیں۔ کہیں ایک اچھوتے نور میں نہائے ہوئے ہرٹیلے، اور کہیں افق کے سحاب پاروں میں کھوئے ہوئے کہسار۔

ہم چپ تھے۔ مجھے معلوم نہ تھا، ہم کتنی دور نکل گئے۔ اور ہمارے کنارے کو چھلتے کتنا وقت ہوگیا

یکایک حبشی خانہ زاد کی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔

"جناب واپس چلئے، آفتاب غروب ہو رہا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پانی کے راستوں پر ہم بھٹک جائیں۔"

بوڑھے ملاح نے اپنے چہرے سے جس پر مسکراہٹ کا شبہ ہو سکتا تھا کہا: "راہ سے بھٹکنا ناممکن ہے۔ میں ساٹھ ستر سال سے ان آبی راستوں کا عادی ہوں۔"

میں ذرا دیر چپ چاپ ملاح کا چہرہ تکتی رہی۔ جس پر زندگی کے گرم و سرد نے طرح طرح کی جھریاں ڈال رکھی تھیں۔ پھر پوچھا: "گویا تم قریب قریب ایک صدی سے یہاں رہتے ہو؟"

"جی ہاں۔"

"تمہارا مکان کہاں ہے؟"

"مکان کہیں نہیں خاتون ——— صنوبر کے ان سایوں تلے پڑا رہتا ہوں۔"
مجھے محسوس ہوا یہ کہتے ہوئے اس کے ضعیف سینے نے اک آہ بھری ہے۔

"صنوبر کے سایوں تلے؟" میں نے حیران ہو کر کہا: "بے پناہ گرمی اور لرزا دینے والی سردی تمہیں زندگی سے بیزار نہیں کرتی۔ اس کا تمہارے پاس کیا علاج ہے؟"

"علاج؟" اس نے ایک پھیکی ہنسی کے ساتھ کہا۔ "میرے پاس پرانی یادیں ہیں۔ جس کے پاس کوئی یاد ہو۔ اس پر کسی موسم کا اثر نہیں ہوتا۔"

میری دلچسپی یکلخت بڑھ گئی۔ "تمہارا ماضی تو افسانوں سے لبریز معلوم ہوتا ہے۔"

مگر بوڑھے نے میری بات کی طرف توجہ نہ دی۔ آپ ہی آپ بڑبڑا رہا

تھا۔ مجھے صنوبر کے سایوں تلے رہنا پسند ہے۔ مجھ پر ان سایوں سے چند گھنٹے کی مفارقت بھی شاق گزرتی ہے۔ جب ہی تو میں شہر میں مزدوری کرنے نہیں جاتا میں ان سایوں تلے کشتی لئے ادھر ادھر پھرتا رہتا ہوں۔"

"کیا تم ہمیں اس راز سے آگاہ کر سکو گے کہ صنوبر کے سایوں سے تمہیں کیوں عشق ہے؟" میں نے التجا کے لہجہ میں پوچھا۔

"یہ کوئی راز نہیں۔" اس نے دم توڑتے ہوئے سورج کے مقابل ایک سیاہ تصویر بن کر کہا۔ "سبھی جانتے ہیں کہ مجھے صنوبر کے سایوں سے کیوں محبت ہے اور کیوں میں اپنی زندگی کے آخری سانس ان کے نیچے ختم کرنا چاہتا ہوں۔"

جسوتی اور میں کہنیاں تکیوں پر رکھ کر متوجہ ہو گئیں۔ کشتی بہاؤ پر جا رہی تھی۔ بڈھا چپو ہاتھ میں تھامے بے پروائی سے اپنی کہانی کہہ رہا تھا۔

(۳)

"آج سے ستر سال پہلے کا ذکر ہے کہ دنیا میری نظروں میں نوجوان تھی۔ زندگی کی ہر ہر کروٹ میں ہزاروں ہی دلفریبیاں محسوس ہوتی تھیں۔ میں غریب ملاح نہ تھا۔ ان پہاڑی علاقوں کا ایک خوشحال تاجر تھا۔

بہار کے موسم میں ایک دن شام کے آسمان پر سنہرا چاند ہنس رہا تھا۔ جب میں اسی روحناک کے ساحل پر انھیں صنوبر کے سایوں تلے چہل قدمی کے لئے نکل آیا۔

میری نظر پہاڑی حسن کے ایک نادر نمونے پر پڑی ...... ایک کمسن لڑکی پر جو صنوبر کے سائے تلے ایک سبز پتھر پر بیٹھی ایک ٹوکری بن رہی تھی۔ مجھ سے

تفصیل کی رنگینی نہ مانگئے۔ رات کا اندھیرا اتر آئے گا۔ سمجھ لیجئے۔ میں خود وہاں نہ آیا تھا مجھے وہ قوت وہاں کھینچ لائی تھی جو ہر نوجوان کے دل کو زندگی کے پھولوں کے درمیان کشاں کشاں لئے پھرتی ہے۔

ہم میں محبت شروع ہو گئی۔ ہم شباب کی ایک رنگین وارفتگی میں باہم محبت کرنے لگے۔ ہم ہر روز انھیں صنوبر کے کانپتے ہوئے سایوں تلے ملتے۔ اور اپنی آرزوئیں ایک دوسرے کے دھڑکتے ہوئے دل سے کہتے۔ بہت جلد ہماری شادی ہو گئی۔"

اسی وقت اچانک صنوبر کے درخت پر سے ایک ناشاد بلبل یکایک چلائی۔ بوڑھے نے مڑ کر اُسے دیکھا اور پھر لرز کر کہا "یہ دیوانہ پرندگیا کہہ رہا ہے؟ یہی نا، کہ محبت بہت ظالم چیز ہے۔"

جسوتی نے مجھے اور میں نے جسوتی کو چپ چاپ دیکھا۔ اس بوڑھے دل میں یقیناً کبھی شعر کے چشمے اُبلتے رہے تھے۔ بوڑھے نے چند ہاتھ چھو کے چلائے اور ایک آہ بھر کر بولا۔

"شادی کے بعد چھ مہینے نہایت سنہرے گزرے۔ پھر ایک نحس خواب نے ہماری زندگی کا رخ پلٹ دیا۔"

ایک صبح جونہی میری بیوی نے تکیے پر نیند سے آنکھیں کھولیں۔ اُداس لہجے میں بولی "میں نے ایک ہولناک خواب دیکھا ہے۔"

میری محبت کی نظروں نے اُس سے پوچھا "کیا خواب؟"

میری بیوی نے آہ کھینچ کر کہا "میں نے رات تقدیر کے فرشتے کو دیکھا جو

پہاڑوں کی بلندیوں پر اپنے پر ہلا ہلا کر کہہ رہا تھا کہ اگر تم نے رات تک اپنے بالوں میں ایک کاسنی رنگ کا گلاب نہ سنوارا تو تمہارا گھر اُجڑ جائے گا۔"

آج سے ستر سال پہلے دُنیا بہت اوہام پرست تھی۔ چنانچہ بیوی کا یہ ہولناک خواب سُن کر میرا عشق سہم گیا گیا۔

میری پریشانی دیکھ کر بیوی بولی "پر اتنے فکر کی کیا بات؟"

میں نے کہا "فکر کیسے نہ ہو؟ شیریں ترین! کیا تجھے نہیں معلوم کہ کاسنی رنگ کا گلاب ان پہاڑی علاقوں میں نایاب ہے؟"

میری بیوی کا چہرہ پیلا پڑ گیا "نایاب؟ پھر کیا کروگے؟ کاسنی رنگ کا گلاب آج رات تک بالوں میں لگانا ضروری ہے، ورنہ ہمارا یہ مسکراتا ہوا گھر تباہ ہو جائیگا۔ فرشتے نے یہی کہا تھا۔"

نامعلوم اندیشوں سے گھبرا کر وہ رونے لگی" میں نے اُس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور وعدہ کیا کہ اطراف کے علاقوں کے تمام باغوں میں شہر کے باغبانوں کو بھیجوں گا اور تاکید کروں گا کہ کسی نہ کسی طرح اُسے دستیاب کر کے کاسنی رنگ کا ایک گلاب لے آئیں۔"

میری بیوی اپنے لمبے لمبے بال کھول کر نہانے کے لئے چشمے پر چلی گئی۔ تاکہ گلاب کے آنے سے پہلے بال سنوار لے۔

میں پریشانی کے عالم میں اُسی وقت کاسنی گلاب کی تلاش میں نکل گیا شہر کے کئی باغبان سے ملا۔ مگر ایک ایک نے کہا کہ اس علاقے میں کاسنی رنگ کا گلاب کہیں نہیں مل سکتا۔ بیزار اور مایوس ہو کر میں حاکم شہر کے باغبان کے ہاں گیا۔ اپنی ضرورت

اس کے آگے کہی۔ وہ بڑا ہی سفاک آدمی تھا۔ سوچ کر بولا " کاسنی گلاب ہمارے باغ میں ہے تو۔ پر اس کی قیمت چھ اشرفی سے کم نہیں "

میں نے چھ اشرفیاں اُس کی ہتھیلی پر رکھ دیں۔ اور کاسنی گلاب لے کر خوش خوش گھر پہنچا۔

میری بیوی کاسنی گلاب دیکھ کر باغ باغ ہو گئی اور مسکرا کر بولی " اگر آج کاسنی گلاب بالوں میں نہ سنوار سکتی تو جانے ہم پر کیا مصیبت آتی "

میں نے کہا " اسے فوراً بالوں میں لگا لو "

پھر نہ جانے اُس نے کس خیال سے کہا " میرے بال گیلے ہیں ابھی، میں نہ لگاؤنگی جب رات شروع ہو گی تو لگا لوں گی "

یہ کہہ کر اس نے ایک بلوری صراحی میں پانی بھرا اور پھول کو اس میں رکھ کر تازہ ہوا کے خیال سے صراحی دریچے میں رکھ دی۔

میں دن بھر گلاب کی سرگردانی میں اپنے کام پر نہ جا سکا تھا۔ دکان پر جا بیٹھا۔ رات کے وقت جب گھر آ رہا تھا تو میرا پرانا دوست حمری مجھے میرے گھر کے قریب ہی مل گیا۔ اُسے میں نے اِدھر کئی ہفتوں سے نہ دیکھا تھا۔ خوش ہو کر گلے سے لگایا۔

" میں تمہارے ہی ہاں گیا تھا۔ تم نہ ملے تو مایوس ہو کر واپس آ گیا "

اس نے یہ جُملہ ختم بھی نہ کیا تھا کہ میری نظر اس کی عبا کے کاج پر پڑ گئی۔ میرا خُون میری رگوں میں جم گیا۔

میں نے یکلخت پوچھا۔ " حمری یہ کاسنی گلاب تمہیں کہاں سے ملا "

حمری طبعاً شوخ تھا، ہنس کر بولا "کیوں؟ تمہیں کیونکر فکر پیدا ہوئی؟ میری محبوبہ نے مجھے تحفہ دیا ہے۔ نایاب چیز ہے"

میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا اور میں لڑکھڑا سا گیا۔ وہ خواب تقدیر کا فرشتہ اس کی پیشین گوئی! سب جھوٹ تھا۔ محض حمری کی عبا کا کاج سجانے کے لئے میری بیوی نے یہ رنگین جھوٹ تراشا تھا۔ ہائے ظالم زندگی! سنگدل زندگی!

(۴)

میں غصہ میں کانپتا ہوا گھر پہنچا۔

مجھے دیکھتے ہی میری بیوی دوڑی آئی۔ اور اشک آلود آنکھوں سے بولی "افسوس! بدبختی دیکھو کہ وہ پھول غائب ہو گیا۔ اے خدا اب میں کیا کروں؟ ہم پر ضرور کوئی مصیبت نازل ہوگی"

"ضرور نازل ہوگی" میں نے گرج کر کہا "موت سے زیادہ بڑی مصیبت اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ سمجھ لو کہ تمہاری موت آ گئی"

بیوی حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔ مگر اس وقت مجھے اُس کی ایک ایک حرکت سے عیاری ٹپکتی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے پھر چیخ کر کہا "تمہاری موت آ گئی۔ تقدیر کے فرشتے کی پیشین گوئی کے لئے تیار ہو جاؤ"

وہ متعجب ہو کر بولی "تم کیا کہتے ہو؟ ایسا نہ کہو۔ خدا کے لئے کاسنی گلاب کو ڈھونڈو۔ میں نے اُسے باغ کی دریچی میں تازہ ہوا کے لئے رکھ دیا تھا، اندر بال سنوارنے گئی تھی۔ واپس آ کر دیکھتی ہوں۔ تو پھول وہاں نہ تھا"

اس نے ان مکار باتوں نے میرے تن بدن میں شعلے بھڑکا دیئے۔ میں نے اسکے

نرم بازوؤں کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں پکڑ لیا اور اس زور سے دیوار پر دھکا دیا کہ ٹکر کھا کر اس کے سر سے خون کا ایک سُرخ فوّارہ پھوٹ پڑا۔

راتوں رات میں نے اُسے اسی صنوبر کے سائے تلے دفنا دیا۔ جہاں اس سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

ایک جنون کی بے اختیاری میں میں گھر کی طرف لوٹ رہا تھا کہ اتفاق سے میرا دوست حمری پھر مجھے ایک گلی کے موڑ پر مل گیا۔ اُسے دیکھتے ہی میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔

وہ ہنس کر بولا۔ " تمہاری آنکھیں ایسی سُرخ ہو رہی ہیں۔ جیسے تم خون کر کے آرہے ہو"

وہ اس طرح باتیں کر رہا تھا گویا میں اس کے راز سے ناواقف ہوں۔

میں نے لپک کر اس کا گریبان پکڑ لیا اور بولا " بدمعاش! تو سمجھتا ہے کہ میں نے خون نہیں کیا ہے اُسے ٹھکانے لگا چکا ہوں"

یہ کہہ کر کاسنی رنگ کا گلاب میں نے اس کی عبا کے کاج سے نوچ کر زمین پر دے مارا، اور اپنے جوتوں کی مجنونانہ حرکت سے مسل ڈالا۔ حمری آنکھوں میں دہشت لئے میرا چہرہ تک رہا تھا۔ جب میں نے اُس سے کہا کہ میں نے اس کی محبوبہ کا خاتمہ کر دیا۔ اور اب اس کا کام تمام کر دینے پر آمادہ ہوں۔ تو اس نے ایک دلدوز چیخ ماری اور کہنے لگا " کوتاہ اندیش اور جلد باز! تو بدبخت ہے! وہ گلاب تو میں نے سڑک پر سے اُٹھایا تھا۔ میں بازار میں سے گزر رہا تھا کہ گلاب کا پھول اُٹھا لیا۔ شاید تمہارے ہی دریچے سے نیچے گر پڑا ہو"

یہ سُنکر میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ ایک ایسا اندھیرا —— جس نے آج تک دُنیا کی نیرنگیوں کو مجھ سے اوجھل کر رکھا ہے۔

(۵)

تقدیر کے فرشتے کا کہنا دُرست نکلا۔ میری بیوی اس رات کاسنی گلاب اپنے بالوں میں نہ سنوار سکی۔ ہمارا گھر میری بیوقوفی اور جلد بازی کے ہاتھوں تباہ ہو گیا۔

آج اس قصّے کو ستّر سال گذر گئے۔ مگر میں اپنی غلطی پر نادم اس مٹّی کی پرستش کر رہا ہوں۔ جس میں ان صنوبر کے سایوں تلے میری محبّت دفن ہے۔"

کشتی ساحل سے آ لگی۔

دِیاسلائی کی ڈِبیہ

جاڑے کا موسم پورے شباب پر تھا۔ سرد ہوا کے جھونکوں سے ہر چیز ٹھٹھری جا رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رگوں میں دوڑنے والا خون جم کر رہ جائے گا۔ بڑی مشکل سے ہاتھوں کی انگلیوں میں خفیف سی جنبش ہوتی تھی اور پاؤں کی انگلیوں کا تو یہ عالم تھا جیسے ان کا تعلق جسم سے منقطع ہو گیا ہو، جیسے وہ اپنا وجود ہوا کے سرد جھونکوں میں تحلیل کر چکی ہوں، اور جیسے پاؤں اُٹھاتے وقت وہ اُس جگہ زمین پر جمی کی جمی رہ جائیں گی۔

میں کلب سے نکل کر دہلی دروازے کے قریب موٹر بس کے انتظار میں کھڑا تھا۔ رات زیادہ نہیں گذری تھی۔ زیادہ سے زیادہ نو بجے ہوں گے پھر بھی بازاروں کی رونق ختم ہو چکی تھی۔ کاروباری لوگ دوکانیں بند کر گئے تھے۔ ہر شخص ٹھنڈ سے بچنے کے لئے گرم گرم لحافوں میں جا دبکا تھا۔ بس کسی عنوان آنے کا

نام نہ لیتی تھی ۔ میں کھڑے کھڑے تھک گیا ۔" کیا اس کی ٹنکی میں پٹرول جم گیا اور وہ راستے میں کہیں رک گئی ؟ " میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا ۔ حالانکہ جانتا تھا کہ پٹرول جم نہیں سکتا لیکن سردی اس بلا کی تھی کہ ناممکنات میں امکان کی صورت پیدا ہو چلی تھی ۔

میں نے اوورکوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال ، مٹھیاں بھینچ ، ٹہلنا شروع کر دیا تاکہ اعضاء کی حرکت سے کچھ گرمی پیدا ہونے لگے ۔ میں نے جیب کے اندر منھ چھپائے پڑی ہوئی ایک ایک چیز کو ٹٹولا ، سگریٹ کیس موجود تھا ، مگر دیا سلائی کی ڈبیہ نہیں تھی ۔ مجید کی یہ پرانی عادت تھی کہ جب کبھی بیڑی سلگانے کے لئے کسی سے دیا سلائی مانگتا ، پوری ڈبیہ ہضم کر لیتا یا اتنی دیر اپنے پاس رکھتا کہ ایک ایک کر کے سب دیا سلائیاں ختم ہو جائیں ۔ میں نے دل ہی دل میں اسے گالیاں دیں اور کچھ عورتوں کے انداز میں کوسا بھی ۔ میں سگریٹ کا زیادہ عادی نہیں ، مسلسل کئی گھنٹے اس کے بغیر گذار سکتا ہوں ، مگر سردی دور کرنے کی ایک ترکیب یہ بھی ہے کہ لمبے لمبے کش لگا کر خوب سگریٹ پئے جائیں ۔ اگر دیا سلائی موجود ہوتی تو جسم میں حرارت پیدا کرنے کا سامان ہو جاتا ۔

سگریٹ والوں کی دکانیں بند ہو چکی تھیں اور پھیری والے

بھی نظر نہ آتے تھے۔

میں دل ہی دل میں بری طرح مجید کو گالیاں دے رہا تھا کہ اتنے میں ایک شخص کمبل میں لپٹا لپٹایا میرے قریب سے گذرا۔ ضرورت بری بلا ہے۔ کبھی کبھی انسانوں کو اپنی سطح سے نیچے گرادیتی ہے۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر سوال کیا۔

"آپ کے پاس دیا سلائی کی ڈبیہ ہے؟"

کلب اور دوسری محفلوں میں ہم ایسی فرمائش اپنے یار دوست سے کر سکتے ہیں۔ کوئی اس جسارت کو معیوب نہیں سمجھ سکتا، لیکن ایک انجان آدمی سے سر راہ جاڑے کے موسم میں اور وہ بھی رات کے نو بجے، اس طرح بے تکلفی کے ساتھ دیا سلائی مانگ بیٹھنا ایک غیر شائستہ حرکت سے ضرور تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

انجان آدمی نے گھور کر کسی قدر معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا جیسے وہ یہ معلوم کرنا چاہتا ہو کہ میں اس سے مذاق تو نہیں کر رہا ہوں۔ مجھے واقعی دیا سلائی کی ڈبیہ کی ضرورت ہے۔ غیر شعوری طور پر میرا ہاتھ جیب میں سگریٹ کیس ٹٹولنے لگا۔ سگریٹ کیس کی سطح برف کی قاش کے مانند سرد ہو رہی تھی۔ میں نے اسے باہر نکال لیا۔ سڑک پر لگی ہوئی بجلی کی تیز روشنی میں اس کا سنہرا کام چمکنے لگا۔

"جی ہاں" نو وارد نے مطمئن ہو کر کہا "دیا سلائی کی ایک

ڈبیہ میرے پاس ہے - ذرا ٹھہریئے ابھی پیش کرتا ہوں"

کمبل کے اندر سے ایک ہاتھ نکلا جو اوور کوٹ کی آستین کے بعد سموری دستانے میں ملفوف تھا - دوسرے ہاتھ میں چھوٹا سا اٹیچی کیس تھا - میں نے خیال کیا کہ یہ شخص کسی چوک پر لوگوں کو جمع کر کے دوا بیچتا ہوگا -

اُس نے آگے بڑھا کر چمڑے کا بکس میرے ہاتھ میں دے دیا - "ذرا تھام لیجئے - میں دیا سلائی کی ڈبیہ ابھی نکال دیتا ہوں"

اُس نے ایک دستانہ اُتار کر اوور کوٹ کی جیب ٹٹولنی شروع کی - اس میں کچھ نہیں تھا - مایوسی اس کے چہرے سے ظاہر ہونے لگی - اس نے فوراً دوسرا دستانہ اُتار دیا تاکہ دوسری طرف کی جیب بھی آسانی سے ٹٹولی جا سکے -

اسی کشمکش میں کمبل کے سرے لٹک کر زمین پر آ رہے - اس کا سر بھی کھل گیا - اس نے خاک دھول سے بچانے کی خاطر کمبل میرے سپرد کر دیا - دستانے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر چکے تھے جو میں نے جلدی سے جھک کر اٹھا لئے - اس نے بڑی تیزی کے ساتھ کوٹ کے اندرونی اور بیرونی جیبوں کو ٹٹولا - دیا سلائی کی ڈبیہ موجود نہیں تھی - یوں ان میں بہت کچھ بھرا ہوا تھا - دو رومال، ایک جوڑہ جوزہ، ایک گھڑی، چار خط، کنجیوں کا گچھا، شو ہورن،

پالش کی ڈبیہ، دوا کی شیشی اور ہلاس کی پڑیا۔ یہ سب چیزیں یکے بعد دیگرے نکال نکال کر میرے سپرد کرتا گیا۔

میں دل ہی دل میں اپنے دوست مجید کو گالیاں دینے لگا۔ میں نے سوچا کہ ضرور اس کا بھی کوئی دوست میرے مجید کا ہم مسلک ہو گا۔ یہ اپنی ڈبیہ کو اسے دے کر بھول گیا اور اب اس کے نہ ملنے پر پریشان ہے۔ میں نے کہا:-

"جانے دیجئے، نہیں ملتی تو نہ سہی، کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ ضرور کوئی پھیری والا ادھر سے گذرے گا۔ میں اس سے خرید لوں گا، یا اتنی دیر میں بس آجائے گی اور میں گھر چلا جاؤں گا۔"

لیکن وہ نہ مانا۔

"نہیں جناب ذرا ٹھہریئے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میرے پاس ایک ڈبیہ ضرور موجود تھی۔ آخر وہ کہاں گئی؟"

اس نے اوور کوٹ اتار کر میرے کاندھے پر ڈال دیا اور چھوٹے کوٹ کے جیب کی تلاشی شروع کر دی۔ ساتھ ہی ساتھ ہوا کے تیز جھونکے اپنا اثر جمانے لگے۔ میں نے دیکھا، اس کا سارا جسم سردی سے کپکپا رہا ہے۔ عین اس وقت اس نے زور سے ایک چھینک لی اور قمیص کے دامن سے ناک پونچھنے لگا۔ بلا سبب تو مجھے اس شخص کے ساتھ ہمدردی پیدا ہو گئی۔ وہ خواہ مخواہ میری وجہ سے

پریشان ہو رہا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو مطعون کیا کہ ایسے بھلے مانس سے دیا سلائی کی ڈبیہ مانگی ہی کیوں؟ اس نے اظہار ندامت کے طور پر کہا:۔

"بات یہ ہے کہ میں یہ کوٹ عموماً پہنا نہیں کرتا، مگر پھر بھی دیا سلائی کی ڈبیہ اس میں ضرور ہوئی جا ہئے۔ ذرا ٹھہریئے۔ ابھی مل جائے گی۔"

تھوڑی ہی دیر میں چھوٹا کوٹ بھی اتر کر میرے شانے پر آگیا۔ وہ جلدی جلدی واسکٹ اور اس کے بعد قمیض کی جیبوں کو ٹٹول رہا تھا۔ مسلسل دو تین چھینکوں سے اس کا دماغ چکرا گیا۔ اتنے میں ہارن کی آواز سنائی دی۔ تیز روشنی کی ایک شعاع میں اس کا افسردہ و مایوس چہرہ چمکنے لگا۔ موٹر بس ہماری طرف بڑھتی چلی آرہی تھی۔ میں نے کہا:۔

"مجھے اسی بس سے جانا ہے۔ آپ زحمت نہ اٹھائیے۔ میں کسی اور سے مانگ لوں گا۔"

میں پشیمان ہو رہا تھا اور وہ بھی بلا وجہ نادم۔ شاید یہ محسوس کر کے کہ اتنی تکلیف برداشت کرنے کے بعد بھی فرمائش پوری نہ ہو سکے گی، اس کا تمام جسم زیادہ تیزی کے ساتھ کپکپانے لگا۔ یقیناً کچھ ہوا کے جھونکوں کا بھی اثر تھا۔ بس بے تحاشا ہماری طرف چلی آرہی تھی۔ پہیوں کی گڑگڑاہٹ سے اس کے رہے سہے ہوش اڑنے

گئے۔ اس نے جلدی سے کنجیوں کا گچھّا میرے ہاتھ سے جھپٹ لیا اور پھر اپنے کپکپاتے ہاتھوں سے چمڑے کا چھوٹا کیس کھول ڈالا۔ عجلت میں اس کے اندر بھرا ہوا متفرق سامان سڑک پر بکھر گیا۔ موٹر بس سڑک پر ہمارے قریب آکر رُک گئی۔

میں نے سب چیزیں اپنے کندھے سے اتار کر اس پر لاد دیں اور معافی مانگتے ہوئے بس کی طرف دَوڑ پڑا۔ دو تین مسافر اس جگہ اُتر رہے تھے۔ مجھے اندر داخل ہونے میں خاصی کشمکش کرنی پڑی۔ میں ابھی اس کے دروازے پر ہی تھا کہ اجنبی نے آگے بڑھ کر دیاسلائی کی ڈبیہ میرے ہاتھ میں تھما دی۔ وہ اٹیچی کیس کی متفرق چیزوں میں رل گئی تھی۔ میں اس کا شکریہ بھی ادا نہ کرسکا۔ میرے ہاتھ میں ڈبیہ دیکھ کر بس کے اندر پہلے سے بیٹھے ہوئے ایک مُسافر نے ہاتھ بڑھایا اور ڈبیہ مانگ لی۔

"ارے! صرف ایک ہی دیاسلائی باقی ہے" اس نے سگریٹ جلاتے ہوئے کہا اور خالی ڈبیہ باہر سڑک پر پھینک دی۔

"ذرا ٹھہریئے" میں فوراً بول پڑا "یہ دیاسلائی پھینکنے کی نہیں۔ مجھے بھی اپنی سگریٹ جلانا ہے"

میں نے جلدی سے اُوورکوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ کیس نکالا۔ اس کی سطح برف کی قاش کے مانند سرد ہو رہی تھی۔ کھٹکے کا بٹن دبا کر میں نے سگریٹ کیس کھولا۔ وہ بالکل خالی تھا۔

"آخر سگریٹ کیا ہوئی؟" میں نے سوچا۔ "کیا دیا سلائی کی ڈبیہ کے ساتھ ان پر بھی مجید نے ہاتھ صاف کر دیا"

بس کے اندر بیٹھا ہوا مسافر اس انتظار میں رہا کہ میں اپنی سگریٹ نکال کر سلگا لوں۔ جلتی ہوئی دیا سلائی کا شعلہ آخر تک پہنچ کر اس کی انگلیوں کو جلانے لگا تھا۔ میں نے پھونک مار کر اسے بجھا دیا اور دل ہی دل میں مجید کو گالیاں دینی شروع کر دیں۔

پوسٹ ماسٹر

پوسٹ ماسٹر نے پہلے اولاپور کے گاؤں میں اپنے فرائض کا بار سنبھالا - گاؤں تو کچھ بڑا نہ تھا، لیکن قریب ہی نیل کا کارخانہ واقع تھا - اس کے انگریز مالک کی کوشش سے یہاں ڈاک خانہ قائم ہوگیا۔

پوسٹ ماسٹر کلکتہ کا رہنے والا تھا - اس دورافتادہ گاؤں میں اس کے دل کی کیفیت ماہیٔ بے آب کی طرح تھی - اس کا دفتر اور رہنے کا کمرہ پھوس کے ایک تاریک چھپر کے نیچے تھا، جس کے پاس ہی گھنی جھاڑیوں اور درختوں میں گھرا ہوا کثیف سبزی مائل ایک تالاب تھا۔

نیل کے کارخانے کے مزدوروں کو دن بھر کام سے فرصت نہ ملتی تھی - اس کے علاوہ ان کی صحبت پڑھے لکھے آدمیوں کے لئے گوارا نہ تھی اور یوں بھی دوسروں سے میل جول پیدا کرنے کے فن میں کلکتہ کے لڑکے کچھ زیادہ مشاق نہیں ہوتے اور اجنبیوں کی نگاہوں میں

وہ یا تو مغرور یا افسردہ دل ٹھہرتے ہیں۔ بہر حال، پوسٹ ماسٹر کی کسی کے ساتھ میل ملاقات نہ تھی اور اس کا کام بھی کچھ زیادہ نہ تھا۔ کبھی کبھار وہ طبع آزمائی کے لئے شعر کہنے میں اپنا وقت گذار دیا کرتا۔ اکثر وہ اس قسم کے جذبات ظاہر کیا کرتا تھا کہ زندگی کو خوش گوار اور پُر مسرت بنانے کے لئے درختوں کی سر سبز پتیوں کی ہلکی ہلکی جنبش اور نیلے آسمان پر مست بادلوں کا خرام ہی کافی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر الف لیلہ کے قصہ کا کوئی دیو ایک رات میں تمام درختوں اور پتوں وغیرہ کو اڑا کر لے جاتا اور ان کی جگہ پتھر کی ایک سڑک چھوڑ کر بلند عمارتوں کی دو رویہ قطاروں کو بادلوں سے نظارہ میں حائل کر دیتا تو یہ بے چارہ اس انقلاب کو اسی طرح ایک نعمتِ غیر مترقبہ سمجھتا۔ گو اسے از سرِ نو زندگی عطا ہوئی ہے۔

پوسٹ ماسٹر کا مشاہرہ قلیل تھا۔ وہ اپنا کھانا اپنے ہاتھ سے پکایا کرتا تھا۔ کھانے میں گاؤں کی ایک یتیم لڑکی، رتن اس کی شریک تھی جو پوسٹ ماسٹر کے گھر کے معمولی کام کر دیا کرتی تھی۔

شام کے وقت جب گوالوں کے گھروں سے دھواں اٹھتا دکھائی دیتا اور جھاڑیوں میں جھینگر شور مچانے لگتے، جب باؤل فرقہ کے گداگروں کے گانے کی آواز ان کے کاشانوں سے بلند ہو کر ہوا کو راگ سے بھرنے لگتی اور جب بانس کے پودوں کے کسی گھنے جھنڈ میں بیٹھ کر پتوں کی جنبش کا مشاہدہ کرنے والا شاعر اپنی روح

میں پُر اسرار لرزش محسوس کرتا۔ پوسٹ ماسٹر اپنا چراغ روشن کر دیتا اور پکار کر کہتا "رتن"۔

رتن باہر بیٹھی اس صدا کا انتظار کیا کرتی تھی۔ وہ دفعتاً اندر داخل ہو جانے کے بجائے جواب دیتی "آپ نے مجھے بُلایا ہے؟"

پوسٹ ماسٹر کہتا "ہاں، تم کیا کر رہی ہو؟"

رتن جواب میں کہتی "میں اب جاکر چولھے میں آگ جلاؤں گی"

اس پر پوسٹ ماسٹر کہتا "چلو چولھے کو ابھی رہنے دو۔ پہلے ذرا میرا حقّہ تو بھر دو"

آخر رتن کوئلوں کو سُلگانے کے لئے پھولے ہوئے گالوں کے ساتھ بڑی بڑی پھونکیں مارتی ہوئی کمرہ میں داخل ہوتی۔ اس طرح پوسٹ ماسٹر کو اس سے مل کر باتیں کرنے کا موقع حاصل ہو جاتا۔ گفتگو کا آغاز شاید اس طرح ہوتا تھا "اچھا رتن! بتاؤ تمہیں اپنی ماں کی کوئی بات یاد ہے؟" یہ موضوع گفتگو کے لئے بہت سیر حاصل تھا۔ رتن کو کچھ باتیں یاد تھیں اور کچھ وہ بھول چکی تھی۔ وہ ماں سے زیادہ باپ کی چہیتی رہ چکی تھی۔ اس لئے باپ اسے اچھی طرح سے یاد تھا۔ وہ دن بھر کے کام کے بعد شام کو گھر آیا کرتا تھا اور ایک آدھ شام کا نقشہ رتن کے ذہن میں بالکل صاف طور پر محفوظ تھا۔ رتن پوسٹ ماسٹر کے قدموں کے قریب

بیٹھ جایا کرتی تھی - اس وقت اسے کثرت سے پرانی باتیں یاد آنے لگتی تھیں - اس کا ایک ننھا سا بھائی ہوتا تھا جس کے ساتھ مل کر اس نے ایک ابر آلود دن کو تالاب کے کنارے مچھلیاں پکڑنے کا کھیل کھیلا تھا - اہم واقعات کی بجائے اسے زیادہ تر اسی قسم کی چھوٹی چھوٹی باتیں یاد تھیں - باتوں ہی باتوں میں بہت سا وقت گذر جاتا - آخر پوسٹ ماسٹر کو کھانا پکانے سے آنکسی آنے لگتی - اس پر رتن جلدی سے اٹھتی، آگ جلاتی اور کچھ روٹی اور صبح کا بچا کھچا سالن گرم کر لیتی جو اُن کے رات کے کھانے کے لئے کافی ہوتا -

بعض اوقات پوسٹ ماسٹر بھی اس وسیع خیالی چھپر کے ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا جہاں اُس کی چھوٹی سی میز پڑی تھی، اپنے گھر کے تصوّر میں محو ہو جایا کرتا - اس کی ماں، اس کی بہن اور دوسرے لوگ جن کے لیۓ اس جبری علحدگی میں اس کا دل بے قرار رہتا تھا، باری باری اُسے یاد آتے - اُن کا خیال ایک لمحہ کے لئے اس سے جدا نہ ہوتا تھا، لیکن اپنے جذبات کا اظہار وہ کارخانہ کے مزدوروں کے سامنے نہ کر سکتا تھا - حالانکہ اس سیدھی سادھی گاؤں کی لڑکی کے سامنے وہ خود بخود بے تکلفانہ طور پر اُن باتوں کا تذکرہ کرنے لگ جاتا - نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکی بھی اس کے سامنے اُس کے گھر والوں کا ذکر اس طرح بھائی، بہن اور

ماں کہہ کر کرتی۔ گویا وہ عمر بھر اُن کے ساتھ رہ چکی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ رتن نے اپنے ذہن میں اُن میں سے ہر ایک کی ایک الگ مکمل صورت قائم کر رکھی تھی۔

برسات کا زمانہ تھا۔ ایک دن دوپہر کے وقت بادل برس کر کھُل چکا تھا۔ ہلکی ہلکی خوش گوار ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ دھوپ میں مرطوب گھاس اور نم آلود پتّوں سے جو خوش بو دار بخار اُٹھ رہے تھے، وہ جسم پر اس طرح محسوس ہوتے گویا تھکی ہوئی زمین کی گرم سانس ہے۔ پاس ہی درختوں کے جھنڈ میں ایک پرندہ بیٹھا تھا جس کے الم انگیز نالوں سے ہوا شام تک پیہم گونجتی رہی۔ شاید وہ فطرت کے دربار میں کوئی شکوہ کر رہا تھا۔

پوسٹ ماسٹر کو کام سے بالکل فراغت تھی۔ درختوں کے پتے جن کا غبار دُھل چکا تھا چمک رہے تھے اور بادلوں کے رہے سہے ٹکڑے آسمان پر تیرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ پوسٹ ماسٹر کی نگاہ اس خوب صورت منظر پر جمی ہوئی تھی اور وہ اپنے دل سے اس طرح باتیں کر رہا تھا۔ "کاش! اس وقت میرا کوئی ہم جنس، کوئی محبت بھرا انسانی چہرہ میرے سامنے ہوتا۔ کاش! میں کسی سے ہم کنار ہو سکتا۔" وہ دل سے اس طرح باتیں کر رہا تھا اور سوچتا تھا کہ شاید یہ پرندہ بھی یہی باتیں کہنا چاہتا ہے اور شاید یہ پتے بھی سرگوشیوں میں انھیں جذبات کے اظہار کی کوشش کر رہے ہیں، لیکن یہ بات

کون جانتا ہے اور کس کے یقین میں آسکتی ہے کہ ایک قلیل مشاہرہ والا دیہاتی پوسٹ ماسٹر کا دل بھی اپنے خشک، غیر شاعرانہ کاروبار کے درمیانی وقفہ میں اس قسم کے جذبات کا مرکز بن سکتا ہے۔

پوسٹ ماسٹر نے ایک آہ سرد بھری اور پھر پکارا "رتن!" رتن اس وقت امرود کے ایک پیڑ کے سایہ میں لیٹی ہوئی کچے امرود کھانے میں مشغول تھی۔ اپنے آقا کی آواز سنتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور یہ الفاظ کہتی ہوئی بھاگی "دادا (دادا بنگالی زبان میں بھائی کو کہتے ہیں) آپ نے مجھے بلایا ہے؟" پوسٹ ماسٹر نے کہا "ہاں! میں سوچ رہا تھا کہ تمہیں لکھنا پڑھنا سکھا دوں" چناں چہ سہ پہر کا باقی حصہ اس نے رتن کو الجبرا سکھانے میں گذارا۔ اس طرح تھوڑے ہی عرصہ میں رتن کو حرف شناسی میں شُد بُد ہو گئی۔

بارش کی کثرت سے جل تھل بھرے ہوئے نظر آتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا گویا برسات کبھی ختم نہ ہو گی۔ نہریں، کھائیاں، گڑھے سب پانی سے ایک ہو رہے تھے۔ دن رات مینہ کی تڑاتڑ اور مینڈکوں کی ٹرّاٹر برابر سنائی دیتی تھی۔ گاؤں کی سڑکیں آمد و رفت کے قابل نہ رہی تھیں۔ ہر قسم کا لین دین اور بیوپار دو نگینوں کی مدد سے ہو رہا تھا۔

ایک رات جب گھنگھور گھٹائیں آسمان پر تُلی کھڑی تھیں،

کالے کالے بادل اُمڈے پڑتے تھے اور گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا رہا تھا۔
پوسٹ ماسٹر کی کم سن شاگرد دیر تک باہر بلاوے کی منتظر بیٹھی رہی، لیکن جب معمول کے خلاف بہت دیر تک پوسٹ ماسٹر نے اُسے آواز نہ دی تو اس نے اپنی کٹی پھٹی جلد والی کتاب اٹھائی اور آہستہ سے کمرے میں داخل ہوئی۔ اپنے آقا کو بستر پر دراز دیکھ کر اور یہ سمجھ کر کہ وہ آرام کر رہا ہے، رتن پنجوں کے بل واپس جانے ہی کو تھی کہ اس نے دفعتاً اپنا نام سُنا "رتن"۔ وہ فوراً پلٹ آئی اور اس سے مخاطب ہو کر کہنے لگی "دادا! آپ سو رہے تھے؟" پوسٹ ماسٹر نے کمزور دھیمی آواز میں جواب دیا "میں اچھا نہیں ہوں۔ میرے ماتھے کو چھو کر دیکھو کتنا گرم ہے"۔

غربت اور تنہائی اور اس پر برسات کی پیدا کی ہوئی اُداسی میں اسے تیمارداری کے لئے کسی محبت بھرے ہاتھ کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ وہ اپنی ماں، اپنی بہنوں کو اپنے پاس موجود خیال کرنے اور اپنے آپ کو اس محبت بھری فضا میں سمجھنے کے لئے، جو عورت ذات ہی پیدا کر سکتی ہے، اپنی پیشانی پر کھنکھناتی چوڑیوں والے نرم و نازک ہاتھوں کے مس کا تصور کرتا۔ اُس غریب کی یہ کوشش رائیگاں نہ گئی۔ رتن جو اب تک محض ایک کم سن لڑکی تھی، فوراً ایک ماں کے فرائض انجام دینے کے لئے تیار ہو گئی۔ اُس نے گاؤں کے ایک وید کو بلایا اور اس کی دی ہوئی

گولیاں مریض کو مناسب اوقات پر دیتی رہی۔ وہ پوسٹ ماسٹر کے لئے دلیہ پکاتی، تمام رات اس کے سرہانے بیٹھے گذار دیتی اور اس سے بار بار پوچھتی "دادا اب آپ پہلے سے کچھ اچھے ہیں؟"

کچھ عرصہ بعد پوسٹ ماسٹر اپنے بستر مرض سے اٹھا۔ لیکن وہ بہت لاغر اور نحیف ہوگیا تھا۔ اب اس نے دل میں یہاں سے اپنا تبادلہ کرانے کا فیصلہ کر لیا اور کلکتہ کے دفتر میں اس مضمون کی درخواست بھیج دی کہ یہ مقام میری صحت کے ناموافق ہے، اس لئے مجھے یہاں سے کسی اور جگہ بھیج دیا جائے۔

رتن تیمارداری کے فرائض سے فراغت پاکر اب پھر دروازہ کے باہر اپنی پہلی جگہ پر بیٹھا کرتی تھی، لیکن پوسٹ ماسٹر نے اسے پہلے کی طرح بلانا چھوڑ دیا۔ بعض اوقات وہ دریچہ کے سوراخ میں سے چوری چوری اندر جھانکتی اور وہ اسے ہوا میں ایک بے معنی ٹکٹکی باندھے، کبھی کرسی پر بیٹھا ہوا اور کبھی اپنے بستر پر بیٹھا ہوا نظر آتا۔ بے چاری لڑکی اپنا آموختہ باربار دہراتی تھا کہ پوسٹ ماسٹر کو فرفر پڑھ کر سنا سکے۔ آخر ہفتہ بھر کے انتظار کے بعد ایک دن اس کی طلبی ہوئی۔ لڑکی کا دل مسرت سے لبریز ہوگیا اور وہ اپنے معمول کے مطابق چلاتی بھاگی۔

"دادا آپ نے مجھے بلایا ہے؟"

پوسٹ ماسٹر نے کہا "ہاں! میں کل جا رہا ہوں"

"دادا آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"میں اپنے وطن کو جا رہا ہوں۔"

"آپ کب تک واپس آئیں گے؟"

"میں اب نہیں آؤں گا۔"

اس کے بعد رتن نے کوئی سوال نہ کیا۔ پوسٹ ماسٹر نے اُسے خود ہی بتایا کہ تبادلے کے متعلق اس کی درخواست منظور نہیں ہوئی، اس لئے وہ ملازمت چھوڑ کر جا رہا ہے۔ بہت دیر تک وہ خاموش رہے۔ چراغ کی لَو مدھم پڑی ہوئی تھی اور ایک کونے میں چھت کے ایک سوراخ میں سے پانی کے قطرے ٹپک ٹپک کر نیچے "مٹی" کے ایک برتن میں جمع ہو رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد رتن کھانے کا انتظام کرنے کے لئے اٹھ کر باہر چلی گئی۔ لیکن اب اس کے چلنے پھرنے میں وہ پہلی سی پھرتی نظر نہ آتی تھی۔ اس کے ننھے سے دماغ میں کئی اندیشے سما گئے تھے۔ جب پوسٹ ماسٹر کھانا کھا چکا تو لڑکی نے اچانک اس سے پوچھا "دادا! آپ مجھے بھی اپنے ساتھ گھر لے چلیں گے؟"

پوسٹ ماسٹر نے ہنس کر کہا "واہ کیا انوکھا خیال ہے" لیکن اس نے لڑکی کو یہ سمجھانا ضروری نہ سمجھا کہ اس بات میں قباحت کیا ہے۔

تمام رات جاگتے اور سوتے پوسٹ ماسٹر کا مضحکہ خیز جواب

غم زدہ لڑکی کے دماغ میں پھرتا رہا۔" واہ کیا انوکھا خیال ہے"!

صبح جب پوسٹ ماسٹر بیدار ہوا تو اس کے لئے غسل کا پانی تیار تھا۔ وہ گاؤں کے لوگوں کی طرح نہانے کے لئے دریا پر نہ جاتا تھا، بلکہ یہاں بھی کلکتہ کے دستور کے مطابق گھڑوں میں پانی لے کر غسل کیا کرتا تھا۔ معلوم نہیں کیوں۔ مگر رتن اس سے روانگی کا وقت دریافت نہ کر سکی، اس لئے وہ طلوعِ آفتاب سے بہت پہلے دریا پر جاکر پانی لے آئی، تاکہ جس وقت اسے ضرورت پڑے، پانی تیار ہو۔

غسل کے بعد پوسٹ ماسٹر نے رتن کو آواز دی اور وہ چپ چاپ اندر داخل ہوئی اور اپنے آقا کا حکم سُننے کے لئے اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔

آقا نے کہا۔" رتن! تمہیں میرے یہاں سے جانے پر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نئے آدمی کو تمہاری خبرگیری کے لئے تاکید کر جاؤں گا"!

بلاشبہ یہ مہربانی کے الفاظ تھے، لیکن آہ! عورت کے دل کو سمجھنا کس قدر دشوار ہے۔

رتن کو اس کے آقا نے کئی دفعہ سخت سُست کہا تھا اور اس کے دل میں اس پر کبھی ذرا سی شکایت بھی پیدا نہ ہوئی تھی۔ آج مہربانی کے یہ الفاظ اس کی برداشت سے باہر تھے۔ اس کی

آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور اس نے روتے ہوئے کہا۔
"نہیں! میرے متعلق کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، میں اب یہاں نہیں رہوں گی۔"

پوسٹ ماسٹر گھبرا کر خاموش ہو گیا۔ اس نے پہلے کبھی رتن کی یہ کیفیت نہ دیکھی تھی۔ نیا آدمی وقت پر آ موجود ہوا اور پوسٹ ماسٹر نے کام اس کے سپرد کر کے رخصت ہونے کی تیاری کی۔ روانگی کے وقت اس نے رتن کو بلا کر کہا۔ "بیٹی، شاید یہ کچھ دنوں تک تمہارے کام آ سکے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے اپنے مشاہرہ کی تمام رقم باہر نکالی۔

رتن اس کے قدموں پر گر کر رونے لگی اور بولی "دادا خدا کے لئے مجھے کچھ نہ دیجئے۔ آپ کو میرے لئے کسی قسم کی تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔" اس کے بعد وہ وہاں سے اٹھی اور کہیں اب چلی گئی۔

پوسٹ ماسٹر نے ایک لمبی آہ بھر کر اپنا بیگ اٹھایا، چھتری اپنے کندھے پر رکھی اور ایک آدمی کے ساتھ جو اس کا ٹین کا بچ رنگا صندوق اٹھائے ہوا تھا، ناؤ میں سوار ہونے کے لئے آہستہ آہستہ روانہ ہوا۔

جب وہ سوار ہو چکا اور کشتی چلنے لگی تو برسات کے چڑھے ہوئے دریا کا پانی جو زمین سے آنسوؤں کے چشمہ کی طرح ابل رہا تھا،

کشتی کی پیشانی کے ساتھ ٹکراتا اور سسکیاں بھرتا ہوا نظر آتا - اس وقت پوسٹ ماسٹر کا جی بھر آیا - یوں معلوم ہوتا تھا کہ دریا خود گاؤں کی اس حیرت زدہ لڑکی کے غم میں شریک ہو کر آنسو بہا رہی ہے - ایک لمحہ کے لئے اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ واپس جاکر اس بدقسمت لاوارث کو اپنے ساتھ لے آئے لیکن ہوا بادبانوں میں بھر چکی تھی اور تیز رَو موجیں کشتی کو کنارے سے بہا کر دریا کے وسط میں پہنچا چکی تھیں - گاؤں بہت پیچھے رہ گیا تھا اور اب صرف مرگھٹ کا بیرونی منظر دکھائی دے رہا تھا -

مسافر بہتی ہوئی موجوں کے سینہ پر سوار، اپنے دل کو ڈھارس دینے کے لئے دنیا کی اَن گنت ملاقاتوں اور بے حساب مفارقتوں اور موت یعنی اِن سب سے بڑی جدائی پر جس کے بعد بازگشت محال ہے، فلسفیانہ غور کرتا ہوا جا رہا تھا -

لیکن رتن فلسفہ نہ جانتی تھی - وہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ڈاک خانہ کے گِرد چکّر لگاتی تھی - ممکن ہے کہ اس کے دل کے کسی گوشہ میں یہ امید دبی ہوئی موجود ہو کہ میرا دادا واپس آجائے گا - شاید اس لئے وہ اس جگہ کو نہ چھوڑ سکتی تھی — آہ! ہماری انسانی فطرت کتنی اَنجان ہے - ہمیں اپنی آرزو و فریب نافہمیوں پر اصرار ہوتا ہے - ہم ان میں گرفتار ہونے کے بعد عقل و استقلال سے کام لینے میں بہت ڈھیل کرتے ہیں، بلکہ حقیقتِ حال پر خود پردہ ڈال دیتا

چاہتے ہیں ۔ انسان بے محابا اپنے دل میں کسی بے حاصل تمنا کی پرورش شروع کر دیتا ہے ۔ آخر ایک دن ایسا آتا ہے کہ دل میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی نہیں رہتا اور پھر یہ تمنا اس قفس کو توڑ کر چلا ہو جاتی ہے ۔ اس وقت ہمیں حقیقت کا خوفناک احساس ہوتا ہے ۔ لیکن اس کے بعد پھر نئے سرے سے ہمارا دل غلطیوں کی اس بھول بھلیاں میں پھنس جانے کے لئے بے قرار ہونے لگتا ہے ۔

کالو بھنگی

میں نے اس سے پہلے ہزار بار کالو بھنگی کے بارے میں لکھنا چاہا ہے لیکن میرا قلم ہر بار یہ سوچ کر رک گیا ہے کہ کالو بھنگی کے متعلق لکھا ہی کیا جاسکتا ہے۔ مختلف زاویوں سے میں نے اس کی زندگی کو دیکھنے، پرکھنے، سمجھنے کی کوشش کی ہے لیکن کہیں وہ ٹیڑھی لکیر دکھائی نہیں دیتی، جس سے دلچسپ افسانہ مرتب ہو سکتا ہے، دلچسپ ہونا تو درکنار، کوئی سیدھا سادا افسانہ تو بے کیف و بے رنگ سے بے جان مرقع بھی تو نہیں لکھا جاسکتا، کالو بھنگی کے متعلق۔۔۔ پھر نہ جانے کیا بات ہے، ہر افسانے کے شروع میں میرے ذہن میں کالو بھنگی آن کھڑا ہوتا ہے اور مجھ سے مسکرا کے پوچھتا ہے "چھوٹے صاحب! مجھ پر کہانی نہیں لکھو گے؟ ۔۔۔۔ کتنے سال ہو گئے تمہیں لکھتے ہوئے۔"

"آٹھ سال"

"کتنی کہانیاں لکھیں تم نے؟"

"ساٹھ اور دو باسٹھ"

"مجھ میں کیا برائی ہے چھوٹے صاحب، تم میرے متعلق کیوں نہیں لکھتے ؟ دیکھو کب سے میں اس کہانی کے انتظار میں کھڑا ہوں۔ تمہارے ذہن کے ایک کونے میں مدّت سے ہاتھ باندھے کھڑا ہوں۔ چھوٹے صاحب، میں تو تمہارا پرانا حلال خور ہوں۔ کالو بھنگی، آخر تم میرے متعلق کیوں نہیں لکھتے ؟"

اور میں کچھ جواب نہیں دے سکتا۔ اس قدر سیدھی سپاٹ زندگی رہی ہے۔ کالو بھنگی کی کہ میں کچھ بھی تو نہیں لکھ سکتا اس کے متعلق۔ یہ نہیں کہ میں اس کے بارے میں کچھ لکھنا ہی نہیں چاہتا، در اصل میں کالو بھنگی کے متعلق لکھنے کا ارادہ ایک مدّت سے کر رہا ہوں۔ لیکن کبھی لکھ نہیں سکا۔ ہزار کوشش کے باوجود نہیں لکھ سکا۔ اس لئے آج تک کالو بھنگی اپنی پرانی جھاڑو لئے، اپنے بڑے بڑے ننگے گھٹنے لئے، اپنے پھٹے پھٹے کھردرے بدہیبت پاؤں لئے، اپنی سوکھی ٹانگوں پر ابھری ابھری وریدیں لئے، اپنے کولہوں کی ابھری ابھری ہڈیاں لئے، اپنے بھوکے پیٹ اور اس کی خشک جلد کی سیاہ سلوٹیں لئے، اپنے مرجھائے ہوئے سینے پر گرد آلود بالوں کی جھاڑیاں لئے، اپنے سکڑے سکڑے ہونٹوں، پھیلے پھیلے نتھنوں، جھرّیوں والے گال اور اپنی آنکھوں کے نیم تاریک گڑھوں کے اوپر ننگی چندیا اٹھائے میرے ذہن کے کونے میں کھڑا ہے۔ اب تک کئی کردار آئے اور اپنی زندگی

بتا کر، اپنی اہمیت جتا کر، اپنی ڈرامائیت ذہن نشین کرا کے چلے
گئے۔ حسین عورتیں، خوبصورت تخیلی ہیولے، شیطان کے چہرے اس
ذہن کے رنگ و روغن سے آشنا ہوئے، اس کی چار دیواری میں اپنے
دیئے جلا کر چلے گئے۔ لیکن کالو بھنگی بدستور اپنی جھاڑو سنبھالے اسی
طرح کھڑا ہے۔ اس نے اس گھر کے اندر آنے والے ہر کردار کو دیکھا ہے
اسے روتے ہوئے گڑگڑاتے ہوئے، محبت کرتے ہوئے، نفرت کرتے
ہوئے، سوتے ہوئے، جاگتے ہوئے، قہقہے لگاتے ہوئے، تقریر کرتے
ہوئے، زندگی کے ہر رنگ میں، ہر پنچ سے ہر منزل میں دیکھا ہے۔
بچپن سے بڑھاپے سے موت تک، اس نے ہر اجنبی کو اس گھر کے
دروازے کے اندر جھانکتے دیکھا ہے اور اسے اندر آتے ہوئے
دیکھ کر اس کے لئے راستہ صاف کر دیا ہے۔ وہ خود پرے ہٹ گیا
ہے۔ ایک بھنگی کی طرح ہٹ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ حتیٰ کہ داستان
شروع ہو کر ختم بھی ہو گئی ہے۔ حتیٰ کہ کردار اور تماشائی دونوں رخصت
ہو گئے ہیں۔ لیکن کالو بھنگی اس کے بعد بھی وہیں کھڑا ہے۔ اب صرف
ایک قدم اس نے آگے بڑھا لیا ہے۔ اور ذہن کے مرکز میں آ گیا ہے
تا کہ میں اسے اچھی طرح دیکھ لوں، اس کی ننگی چندیا چمک رہی ہے۔
اور ہونٹوں پر ایک خاموش سوال ہے، ایک عرصے سے میں اسے دیکھ
رہا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا لکھوں گا اس کے بارے میں، لیکن آج یہ
بھوت ایسے مانے گا نہیں، اسے کئی سالوں تک ٹالا ہے، آج اسے بھی

الوداع کہہ دیں ... ... ؟

میں سات برس کا تھا، جب میں نے کالو بھنگی کو پہلی بار دیکھا۔
اس کے بیس برس بعد جب وہ مرا، میں نے اسے اسی حالت میں دیکھا۔
کوئی فرق نہ تھا۔ وہی گھٹنے، وہی پاؤں، وہی پاؤں، وہی چہرہ، وہی
چندیا، وہی ٹوٹے ہوئے دانت، جھاڑو جو ایسا معلوم ہوتا تھا، ماں
کے پیٹ سے اٹھائے چلا آ رہا ہے، کالو بھنگی کی جھاڑو اس کے جسم
کا ایک حصہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ ہر روز مریضوں کا بول و براز صاف
کرتا تھا۔ ڈسپنسری میں فینائل چھڑکتا تھا۔ پھر ڈاکٹر صاحب اور
کمپونڈر صاحب کے بنگلوں میں صفائی کا کام کرتا تھا۔ کمپونڈر صاحب
کی بکری اور ڈاکٹر صاحب کی گائے کو چرانے کے لئے جنگل میں لے جاتا
اور دن ڈھلتے ہی انھیں واپس ہسپتال میں لے آتا اور مویشی خانے
میں باندھ کر اپنا کھانا تیار کرتا اور اسے کھا کر سو جاتا۔ بیس سال سے
اسے میں یہی کام کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ہر روز، بلا ناغہ۔ اس عرصے
میں وہ کبھی ایک دن کے لئے بھی بیمار نہیں ہوا۔ یہ امر تعجب خیز ضرور تھا۔
لیکن اتنا بھی نہیں کہ محض اسی کے لئے ایک کہانی لکھی جائے۔ خیر یہ کہانی
تو زبردستی لکھوائی جا رہی ہے۔ آٹھ سال سے میں اسے ٹالتا آیا ہوں۔
لیکن یہ شخص نہیں مانا۔ زبردستی سے کام لے رہا ہے۔ یہ ظلم مجھ پر بھی ہے
اور آپ پر بھی۔ مجھ پر اس لئے کہ مجھے لکھنا پڑ رہا ہے۔ آپ پر اس لئے

کہ آپ کو اسے پڑھنا پڑ رہا ہے۔ درحالیکہ اس میں کوئی ایسی بات ہی نہیں جس کے لیے اس کے متعلق اتنی دردِسری مول لی جائے، اگر کیا کیا جائے کالوبھنگی کی خاموش نگاہوں کے اندر ایک ایسی کھنچی کھنچی سی ملتجیانہ کاہش ہے۔ ایک ایسی مجبور بے زبانی ہے، ایک ایسی مجبور گہرائی ہے کہ مجھے اس کے متعلق لکھنا پڑ رہا ہے۔ اور لکھتے لکھتے یہ بھی سوچتا ہوں کہ اس کی زندگی کے متعلق کیا لکھوں گا میں۔ کوئی پہلو بھی تو ایسا نہیں جو دلچسپ ہو۔ کوئی کونہ ایسا نہیں جو تاریک ہو، کوئی زاویہ ایسا نہیں جو مقناطیسی کشش کا حامل ہو۔ ہاں آٹھ سال سے متواتر میرے ذہن میں کھڑا ہے، نہ جانے کیوں۔ اس میں اس کی ہٹ دھرمی کے سوا اور تو مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ جب میں نے آنگی کے افسانے میں چاندنی نے کھلیان سجائے تھے۔ اور یہ قانیت کے رومانی نظریے سے دنیا کو دیکھا تھا۔ اس وقت بھی یہ ذہن میں کھڑا تھا۔ جب میں نے رومانیت سے آگے سفر اختیار کیا اور حسن اور حیوان کی بوقلموں کیفیتیں دیکھتا ہوا اڑتے ہوئے تاروں کو چھونے لگا اس وقت بھی یہ وہیں تھا۔ جب میں نے بالکونی سے جھانک ان داتاؤں کی غربت دیکھی۔ اور پنجاب کی سرزمین پر خون کی ندیاں بہتی دیکھ کر اپنے وحشی ہونے کا علم حاصل کیا۔ اسوقت بھی یہ وہیں میرے ذہن کے دروازے پر کھڑا تھا۔ ختم شد۔ مگر اب یہ جائے گا ضرور۔ اب کے اسے جانا ہی پڑے گا۔ اب میں اس کے بارے میں لکھ رہا ہوں۔ للّٰہ اس کی بے کیف، بے رنگ، پھیکی

سیٹھی کہانی بھی سن لیجیے تاکہ یہ یہاں سے دور رفان ہو جائے، اور مجھے اس کے غلط قرب سے نجات ملے، اور اگر آج بھی میں نے اس کے بارے میں نہ لکھا، اور نہ آپ نے اسے پڑھا تو یہ آٹھ سال بعد بھی یہیں جما رہے گا۔ اور ممکن ہے زندگی بھر یہیں کھڑا رہے۔

لیکن پریشانی تو یہ ہے کہ اس کے بارے میں کیا لکھا جا سکتا ہے کالو بھنگی کے ماں باپ بھنگی تھے، اور جہاں تک میرا خیال ہے اس کے سارے آباد اجداد بھنگی تھے، اور سینکڑوں برس سے یہیں رہتے چلے آئے تھے۔ اسی طرح اسی حالت میں۔ پھر کالو بھنگی نے شادی نہ کی تھی۔ اس نے کبھی عشق نہ کیا تھا۔ اس نے کبھی دور دراز کا سفر نہیں کیا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ وہ کبھی اپنے گاؤں سے باہر نہیں گیا تھا۔ وہ دن بھر اپنا کام کرتا اور رات کو سو جاتا۔ اور صبح اٹھ کے پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا، بچپن ہی سے وہ اسی طرح کرتا چلا آیا تھا۔

ہاں کالو بھنگی میں ایک بات ضرور دلچسپ تھی۔ اور وہ یہ کہ اسے اپنی سنگی چند یا پر کسی جانور، مثلاً گائے یا بھینس کی زبان پھرانے سے بڑا لطف حاصل ہوتا تھا۔ اکثر دوپہر کے وقت میں نے اسے دیکھا ہے۔ کہ نیلے آسمان تلے، سبز گھاس کے مخملیں فرش پر کھلی دھوپ میں وہ ہسپتال کے قریب ایک کھیت کی مینڈھ پر اکڑوں بیٹھا ہے۔ اور گائے اس کا سر چاٹ رہی ہے۔ بار بار۔ اور وہ وہیں اپنا سر چٹواتا چٹواتا اونگھتا اونگھتا سو گیا ہے۔ اسے اس طرح سوتے دیکھ کر میرے دل میں

مسرت کا ایک عجیب سا احساس اُجاگر ہونے لگتا تھا۔ اور کائنات پے تھکے تھکے غنودگی آمیز آفاقی حسن کا گمان ہونے لگتا تھا۔ میں نے اپنی چھوٹی سی زندگی میں دنیا کو حسین ترین عورتیں پھولوں کے تازہ ترین غنچے، کائنات کے خوبصورت ترین مناظر تک دیکھے ہیں۔ لیکن نہ جانے کیوں ایسی معصومیت، ایسا حسن، ایسا سکون کسی منظر میں نہیں دیکھا، جتنا اس منظر میں کہ جب میں سات برس کا تھا اور وہ کھیت بہت بڑا اور وسیع دکھائی دیتا تھا اور آسمان بہت نیلا اور صاف، اور کالو بھنگی کی چندیا شیشے کی طرح چمکتی تھی، اور گائے کی زبان آہستہ آہستہ اس کی چندیا چاٹتی ہوئی، اسے گویا سہلاتی ہوئی کسر کسر کی خوابیدہ آواز پیدا کرتی جاتی تھی، جی چاہتا تھا، میں بھی اسی طرح اپنا سر گھٹا کے اس گائے کے نیچے بیٹھ جاؤں اور اونگھتا اونگھتا سو جاؤں، ایک دفعہ میں نے ایسا کرنے کی کوشش بھی کی تو والد صاحب نے مجھے وہ پیٹا وہ پیٹا اور مجھ سے زیادہ غریب کالو بھنگی کو وہ پیٹا کہ میں خود ڈر کے مارے چیخنے لگا کہ کالو بھنگی کہیں ان کی ٹھوکروں سے مر نہ جائے۔ لیکن کالو بھنگی کو اتنی مار کھا کے بھی کچھ نہ ہوا، دوسرے روز وہ بدستور جھاڑو دینے کے لئے ہمارے بنگلے میں موجود تھا۔

کالو بھنگی کو جانوروں سے بڑا لگاؤ تھا۔ ہماری گائے تو اس پر جان چھڑکتی تھی۔ اور کمپونڈر صاحب کی بکری بھی۔ حالانکہ بکری بڑی بے وفا ہوتی ہے، عورت سے بھی بڑھ کے۔ لیکن کالو بھنگی کی بات اور تھی،

ان دونوں جانوروں کو پانی پلائے تو کالو بھنگی، چارہ کھلائے تو کالو بھنگی، جنگل میں چرائے تو کالو بھنگی، اور رات کو مویشی خانے میں باندھے تو کالو بھنگی، وہ اس کے ایک ایک اشارے کو اس طرح سمجھ جاتیں۔ جس طرح کوئی انسان کسی انسان کے بچے کی باتیں سمجھتا ہے میں کئی بار کالو بھنگی کے پیچھے گیا ہوں، جنگل میں راستے میں وہ انھیں بالکل کھلا چھوڑ دیتا ہے لیکن پھر بھی گائے اور بکری دونوں اس کے ساتھ قدم سے قدم ملائے چلے آتے تھے، گویا تین دوست سیر کرنے نکلے ہیں۔ راستے میں گائے نے سبز گھاس دیکھ کر منہ مارا تو بکری بھی جھاڑی سے پتیاں کھانے لگتی اور کالو بھنگی ہے کہ سنبلو توڑ توڑ کے کھا رہا ہے اور بکری کے منہ میں ڈال رہا ہے۔ اور خود بھی کھا رہا ہے، اور آپ ہی آپ باتیں کر رہا ہے، اور ان سے بھی برابر باتیں کئے جا رہا ہے۔ اور وہ دونوں جانور کبھی کبھی غرا کر کبھی کان پھٹپھٹا کر، کبھی پاؤں ہلا کر، کبھی دم دبا کر، کبھی ناچ کر، کبھی گا کر، ہر طرح سے اس کی گفتگو میں شریک ہو رہے ہیں۔ اپنی سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا تھا کہ یہ لوگ کیا باتیں کرتے تھے، پھر چند لمحوں کے بعد کالو بھنگی آگے چلنے لگتا تو گائے بھی چرنا چھوڑ دیتی اور بکری بھی جھاڑی سے پرے ہٹ جاتی اور کالو بھنگی کے ساتھ ساتھ چلنے لگتی۔ آگے کہیں چھوٹی سی ندی آتی یا کوئی ننھا ننھا چشمہ، تو کالو بھنگی وہیں بیٹھ جاتا بلکہ لیٹ کر وہیں چشمے کی سطح سے اپنے ہونٹ ملا دیتا۔ اور جانوروں کی طرح پانی پینے لگتا اور اسی طرح وہ دونوں جانور بھی پانی پینے لگتے۔ کیونکہ بیچارے انسان تو

نہیں بھتے کر ادک سے پی سکتے، اس کے بعد اگر کالو بھنگی سبزے پر
لیٹ جاتا تو بکری کبھی اس کی ٹانگوں کے پاس اپنی ٹانگیں سکیڑ کر دعائیہ
انداز میں بیٹھ جاتی اور گائے تو اس انداز سے اس کے قریب ہو بیٹھتی
کہ مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ کالو بھنگی کی بیوی ہے اور ابھی ابھی کھانا
پکا کے فارغ ہوئی ہے۔ اس کی ہر نگاہ میں اور چہرے کے ہر اتار
چڑھاؤ میں اک سکون آمیز گرہستی انداز جھلکنے لگتا، اور جب وہ
جگالی کرنے لگتی تو مجھے معلوم ہوتا گویا کوئی بڑی سگھڑ بیوی کروشیا
لئے سوزن کاری میں مصروف ہے اور کالو بھنگی کا سویٹر بن رہی ہے۔
اس گائے اور بکری کے علاوہ ایک لنگڑا کتا تھا جو کالو بھنگی
کا بڑا دوست تھا۔ وہ لنگڑا تھا اور اس لئے دوسرے کتوں
کے ساتھ زیادہ چل پھر نہ سکتا تھا۔ اور اکثر اپنے لنگڑے
ہونے کی وجہ سے دوسرے کتوں سے پٹتا اور بھوکا رہتا،
اور زخمی رہتا۔ کالو بھنگی اکثر اس کی تیمارداری اور خاطر و تواضع
میں لگا رہتا، کبھی تو صابن سے اسے نہلاتا، کبھی اس کی چچڑیاں دور
کرتا، اس کے زخموں پر مرہم لگاتا، اسے مکی کی روٹی کا سوکھا ٹکڑا
دیتا، لیکن یہ کتا بڑا خود غرض جانور تھا۔ دن میں صرف دو مرتبہ
کالو بھنگی سے ملتا۔ دوپہر کو اور شام کو، اور کھانا کھا کے اور
زخموں پر مرہم لگوا کے پھر گھومنے کے لئے چلا جاتا، کالو بھنگی اور
اس لنگڑے کتے کی ملاقات بڑی مختصر ہوتی تھی اور بڑی دلچسپ،

مجھے تو وہ کتّا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا، لیکن کالو بھنگی اسے ہمیشہ بڑے تپاک سے ملتا تھا۔

اس کے علاوہ کالو بھنگی کی جنگل کے ہر جانور چرند اور پرند سے شناسائی تھی۔ راستے میں اس کے پاؤں میں کوئی کیڑا آجاتا تو وہ اسے اٹھا کر جھاڑی پر رکھ دیتا، کہیں کوئی بنولا بولنے لگتا تو یہ اس کی بولی میں اس کا جواب دیتا، تیتر، رت گلہ، گٹاری، لال چڑا، سبزہ مکھی، ہر پرندے کی زبان وہ جانتا تھا۔ اس لحاظ سے وہ راہُل سنکرتائن سے بھی بڑا پنڈت تھا۔ کم از کم میرے جیسے سات برس کے بچّے کی نظروں میں تو وہ مجھے اپنے ماں باپ سے بھی اچھا معلوم ہوتا تھا اور پھر وہ مکّی کا بھٹّا ایسے مزے کا تیار کرتا تھا، اور آگ پر اسے اس طرح مدھم آنچ پر بھونتا تھا کہ مکّی کا ہر دانہ کندن بن جاتا، اور دانے ٹیتے ہیں شہد کا مزا دیتا، اور خوشبو بھی ایسی سوندھی سوندھی، میٹھی میٹھی، جیسے دھرتی کی سانس! نہایت آہستہ آہستہ بڑے سکون سے، بڑی مشاقی سے وہ بھٹّے کو ہر طرف سے دیکھ دیکھ کر اسے بھونتا تھا جیسے وہ برسوں سے اس بھٹّے کو جانتا تھا۔ اک دوست کی طرح وہ بھٹّے سے باتیں کرتا، اتنی نرمی اور مہربانی اور شفقت سے اس سے پیش آتا گویا وہ بھٹا اس کا اپنا رشتہ دار یا سگا بھائی تھا۔ اور لوگ بھی بھٹا بھونتے تھے مگر وہ بات کہاں، اس قدر کچّے، بدذائقہ اور معمولی سے بھٹّے ہوتے تھے، وہ کہ انھیں بس مکّی کا بھٹا ہی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن

کالو کھبنگی کے ہاتھوں میں پہنچ کے وہی بھٹّا کچھ کا کچھ ہو جاتا، اور جب وہ آگ پر سینک کے بالکل تیار ہو جاتا تو بالکل اک نئی نویلی دلہن کی طرح عروسی لباس پہنے سنہرا سنہرا چمکتا نظر آتا۔ میرے خیال میں خود بھٹے کو یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ کالو اس سے کتنی محبت کرتا ہے، ورنہ محبت کے بغیر اس بے جان شے میں اتنی رعنائی کیسے پیدا ہو سکتی تھی، مجھے کالو کھبنگی کے ہات کے سینکے ہوئے بھٹے کھانے میں بڑا مزا آتا تھا۔ اور میں انھیں بڑے مزے میں چھپ چھپ کے کھاتا تھا، ایک دفعہ پکڑا گیا تو بڑی ٹھکائی ہوئی۔ بری طرح، بے چارا کالو کھبنگی بھی پٹا مگر دوسرے دن وہ پھر بنگلے پر جھاڑو دینے کے لئے اسی طرح حاضر تھا۔

اور بس کالو کھبنگی کے متعلق کوئی دلچسپ بات یاد نہیں آرہی۔ میں بچپن سے جوانی میں آیا اور کالو کھبنگی اسی طرح رہا، میرے لئے اب وہ کم دلچسپ ہو گیا تھا۔ بلکہ یوں کہئے کہ مجھے اس سے کسی طرح کی دلچسپی نہ رہی تھی، ہاں کبھی کبھی اس کا کردار مجھے اپنی طرف کھینچتا۔ ان دنوں کی بات ہے جب میں نے نیا نیا لکھنا شروع کیا تھا۔ میں مطالعہ کے لئے اس سے سوال پوچھتا اور نوٹ لینے کے لئے فاونٹین پن اور پیڈ ساتھ رکھ لیتا۔

"کالو کھبنگی تمہاری زندگی میں کوئی خاص بات ہے؟"

"کیسی بھوسے صاحب؟"

"کوئی خاص بات، عجیب، انوکھی، نئی"

"نہیں چھوٹے صاحب" (یہاں تک تو مشاہدہ صفر رہا، اب آگے چلیے، ممکن ہے ... ... !)

"اچھا تم یہ بتاؤ کہ تم تنخواہ لے کر کیا کرتے ہو؟ ہم نے دوسرا سوال پوچھا۔

"تنخواہ لے کر کیا کرتا ہوں" وہ سوچنے لگتا۔ "آٹھ روپے ملتے ہیں مجھے" پھر وہ انگلیوں پر گننے لگتا "چار روپے کا آٹا لاتا ہوں ... ...، ایک روپے کا نمک، ایک روپے کا تمباکو، آٹھ آنے کی چائے، چار آنے کا گڑ، چار آنے کا مصالحہ، کتنے روپے ہو گئے چھوٹے صاحب؟"

"سات روپے"

"ہاں سات روپے، ہر مہینے ایک روپیہ بنئے کو دیتا ہوں اس سے کپڑے سلوانے کے لئے روپے کرج لیتا ہوں نا، سال میں دو جوڑے تو چاہئیں، کمبل تو میرے پاس ہے، خیر، لیکن دو جوڑے تو چاہئیں، اور چھوٹے صاحب، کہیں بڑے صاحب ایک روپیہ تنخواہ میں بڑھا دیں تو مجا آجائے!"

"وہ کیسے؟"

"گھی لاؤں گا ایک روپے کا، دو رتی کے پراٹھے کھاؤں گا۔ کبھی پراٹھے نہیں کھائے مالک، بڑا جی چاہتا ہے!"

اب بولئے ان آٹھ روپوں پر کوئی کیا افسانہ لکھے۔

پھر جب میری شادی ہو گئی، جب راتیں جوان اور جمکدار ہونے لگتیں اور قریب کے جنگل سے شہد اور کستوری اور جنگلی گلاب کی خوشبوئیں آنے لگتیں اور ہرن چوکڑیاں بھرتے ہوئے دکھائی دیتے اور تارے جھکتے جھکتے کانوں میں سرگوشیاں کرنے لگتے اور کسی کے رسیلے ہونٹ آنے والے بوسوں کا خیال کر کے کانپنے لگتے، اس وقت بھی میں کالو بھنگی کے متعلق کچھ لکھنا چاہتا اور پنسل کاغذ لے کے اس کے پاس جاتا۔

"کالو بھنگی تم نے بیاہ نہیں کیا؟"

"نہیں چھوٹے صاحب"

"کیوں؟"

"اس علاقے میں بس ایک بھنگی ہوں۔ اور دور دور تک کوئی بھنگی نہیں ہے چھوٹے صاحب، پھر ہماری شادی کیسے ہو سکتی ہے!" (لیجئے یہ راستہ بھی بند ہوا)

"تمہارا جی نہیں چاہتا کالو بھنگی؟" میں نے دوبارہ کوشش کر کے کچھ کریدنا چاہا۔

"کیا صاحب؟"

"عشق کرنے کے لئے جی چاہتا ہے تمہارا؟ شاید کسی سے محبت کی ہوگی تم نے، جبھی تم نے اب تک شادی نہیں کی"

"عشق کیا ہوتا ہے۔ چھوٹے صاحب؟"

"عورت سے عشق کرتے ہیں لوگ"

"عشق کیسے کرتے ہیں صاحب؟ شادی تو ضرور کرتے ہیں سب لوگ، بڑے لوگ عشق بھی کرتے ہوں گے چھوٹے صاحب۔ مگر ہم نے نہیں سنا وہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں، رہی شادی کی بات، وہ میں نے آپ کو بتادی۔ شادی کیوں نہیں کی میں نے، کیسے ہوتی شادی میری، آپ بتائیے؟"... ... (ہم کیا بتائیں خاک)

"تمہیں افسوس نہیں ہے کالو بھنگی؟"

"کس بات کا افسوس؟ چھوٹے صاحب"

میں نے ہار کر اس کے متعلق لکھنے کا خیال چھوڑ دیا۔

آٹھ سال ہوئے کالو بھنگی مر گیا۔ وہ جو کبھی بیمار نہیں ہوا تھا، اچانک ایسا بیمار پڑا کہ پھر کبھی بستر علالت سے نہ اٹھا، اسے ہسپتال میں مریض رکھوا دیا تھا۔ وہ الگ وارڈ میں رہتا تھا کمپونڈر دور سے اس کے حلق میں دوا انڈیل دیتا۔ اور ایک چپراسی اس کے لئے کھانا رکھ آتا، وہ اپنے برتن خود صاف کرتا، اپنا بستر خود کرتا، اپنا بول و براز خود صاف کرتا۔ اور جب وہ مر گیا تو اس کی لاش کو پولیس والوں نے ٹھکانے لگا دیا۔ کیونکہ اس کا کوئی وارث نہ تھا۔ وہ ہمارے ہاں بیس سال سے رہتا تھا۔ لیکن ہم کوئی اس کے رشتے دار تھوڑی تھے۔ اس لئے اس کی آخری تنخواہ بھی بحق سرکار ضبط ہو گئی۔ کیونکہ کوئی اس کا وارث

نہ تھا، اور جب وہ مرا اس روز بھی کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ روز کی طرح اس روز بھی ہسپتال کھلا۔ ڈاکٹر صاحب نے نسخے لکھے، کمپونڈر نے تیار کئے، مریضوں نے دوا لی اور گھر لوٹ گئے۔ پھر روز کی طرح ہسپتال بھی بند ہوا۔ اور گھر آن کر ہم سب نے آرام سے کھانا کھایا۔ ریڈیو سنا اور لحاف اوڑھ کر سو گئے۔ صبح اٹھے تو پتہ چلا کہ پولیس والوں نے از راہِ کرم کالو بھنگی کی لاش ٹھکانے لگوا دی، اس پر ڈاکٹر صاحب کی گائے نے اور کمپونڈر صاحب کی بکری نے دو روز تک نہ کچھ کھایا نہ پیا، اور وارڈ کے باہر کھڑے بے کار چلاتی رہیں جانوروں کی ذات ہے نا آخر۔

ارے تو پھر جھاڑو لے کر آن پہنچا! آخر کیا چاہتا ہے؟ بتا دے۔

کالو بھنگی ابھی تک وہیں کھڑا ہے۔

کیوں بھئی، اب تو میں نے سب کچھ لکھ دیا، وہ سب کچھ جو میں تمہاری بابت جانتا ہوں۔ اب بھی یہیں کھڑے ہو۔ پریشان کر رہے ہو۔ للٰہ چلے جاؤ، کیا مجھ سے کچھ چھوٹ گیا ہے۔ کوئی بھول ہو گئی ہے؟ تمہارا نام۔ کالو بھنگی۔ کام۔ بھنگی۔ اس علاقے سے کبھی باہر نہیں گئے۔ شادی نہیں کی۔ عشق نہیں لڑایا۔ زندگی میں کوئی ہنگامی بات نہیں ہوئی۔ کوئی اچنبھا، معجزہ نہیں ہوا۔ جیسے محبوبہ کے ہونٹوں میں ہوتا ہے، اپنے بچے

کے پیار میں ہوتا ہے۔ غالب کے کلام میں ہوتا ہے۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا تمہاری زندگی میں۔ پھر میں کیا لکھوں۔ اور کیا لکھوں؟ تمہاری تنخواہ آٹھ روپے، چار روپے کا آٹا، ایک روپے کا نمک، ایک روپے کا تمباکو، آٹھ آنے کی چائے، چار آنے کا گڑ، چار آنے کا مصالحہ، سات روپے، اور ایک روپیہ بنئے کا، آٹھ روپے ہو گئے، مگر آٹھ روپے میں کہانی نہیں ہوتی، آج کل تو پچیس پچاس سو میں نہیں ہوتی۔ مگر آٹھ روپے میں تو شرطیہ کوئی کہانی نہیں ہو سکتی۔ پھر میں کیا لکھ سکتا ہوں تمہارے بارے میں۔ اب غلجی ہی کو لو ہسپتال میں کمپونڈر ہے بتیس روپے تنخواہ پاتا ہے۔ وراثت سے نچلے متوسط طبقے کے ماں باپ ملے تھے، جنھوں نے مڈل تک پڑھا دیا۔ پھر غلجی نے کمپونڈری کا امتحان پاس کر لیا۔ وہ جوان ہے، اس کے چہرے پر رنگت ہے۔ جوانی، یہ رنگت کچھ چاہتی ہے، وہ سفید لٹھے کی شلوار پہن سکتا ہے۔ قمیص پر کلف لگا سکتا ہے۔ بالوں میں خوشبودار تیل لگا کر کنگھی کر سکتا ہے۔ سرکار نے اسے رہنے کے لئے ایک چھوٹا سا بنگلہ نما کوارٹر بھی دے رکھا ہے۔ ڈاکٹر چوک جائے تو فیس بھی جھاڑ لیتا ہے۔ اور خوبصورت مریضاؤں سے عشق بھی کر لیتا ہے۔ وہ نوراں اور غلجی کا واقعہ نہیں یاد ہو گا۔ نوراں بجھتا سے آئی تھی۔ سولہ سترہ برس کی بھرپور جوانی، چار کوس سے سینما کے رنگین اشتہار کی طرح نظر آجاتی تھی۔ بڑی بیوقوف تھی وہ اپنے گاؤں کے دو نوجوانوں کا عشق قبول کئے بیٹھی تھی۔

جب نمبردار کا لڑکا سامنے آجاتا تو اس کی ہو جاتی۔ اور جب پٹواری کا لڑکا دکھائی دیتا تو اس کا دل اس کی طرف مائل ہونے لگتا اور وہ کوئی فیصلہ ہی نہیں کر سکتی تھی۔ بالعموم عشق کو لوگ ایک بالکل واضح، قاطع، یقینی امر سمجھتے ہیں۔ درحالیکہ یہ عشق اکثر بڑا متذبذب، غیر یقینی، گومگو حالت کا حامل ہوتا ہے۔ یعنی عشق اُس سے بھی ہے اِس سے بھی ہے۔ اور پھر شاید کہیں نہیں ہے۔ اور ہے بھی تو اس قدر وقتی، گرگٹی، ہنگامی، کہ ادھر نظر چوکی ادھر عشق غائب۔ سچائی ضرور ہوتی ہے۔ لیکن ابدیت مفقود ہوتی ہے اسی لئے تو لوراں کوئی فیصلہ نہیں کر پاتی تھی۔ اس کا دل نمبردار کے بیٹے کے لئے بھی دھڑکتا تھا۔ اور پٹواری کے پوت کے لئے بھی۔ اس کے ہونٹ نمبردار کے بیٹے کے ہونٹوں سے مل جانے کے لئے بیتاب ہو اٹھتے اور پٹواری کے پوت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہی اس کا دل یوں کانپنے لگتا، جیسے چاروں طرف سمندر ہو، چاروں طرف لہریں ہوں، اور ایک اکیلی کشتی ہو اور نازک سی پتوار ہو اور چاروں طرف کوئی نہ ہو، اور کشتی ڈولنے لگے، ہولے ہولے ڈولتی جائے، اور نازک سی پتوار نازک سے ہاتھوں سے چلتی چلتی تھم جائے، اور سانس رکتے رکتے رک سی جائے، اور آنکھیں جھکتی جھکتی جھک سی جائیں اور زلفیں بکھرتے بکھرتے بکھر سی جائیں، اور لہریں گھوم گھوم کر گھومتی ہوئی معلوم نہیں۔ اور بڑے بڑے دائرے پھیلتے پھیلتے پھیل جائیں، اور پھر چاروں طرف سناٹا پھیل جائے اور دل ایک دم دھک سے

رہ جائے، اور کوئی اپنی باہنوں میں بھینچ لے۔ ہائے۔ پٹواری کے بیٹے کو دیکھنے سے ایسی حالت ہوتی تھی نوراں کی۔ اور وہ کوئی فیصلہ نہ کرسکتی تھی۔ نمبردار کا بیٹا۔ پٹواری کا بیٹا۔ پٹواری کا بیٹا، نمبردار کا بیٹا، وہ دونوں کو زبان دے چکی تھی۔ دونوں سے شادی کرنے کا اقرار کرچکی تھی۔ دونوں پر مرمٹی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ آلیس میں لڑتے لڑتے لہولہان ہوگئے، اور جب جوانی کا بہت سا لہو رگوں سے نکل گیا تو انھیں اپنی بے وقوفی پر بڑا غصہ آیا، اور پہلے نمبردار کا بیٹا نوراں کے پاس پہونچا، اور اپنی چھری سے اسے ہلاک کرنا چاہا۔ اور نوراں کے بازو پر زخم آگئے، اور پھر پٹواری کا پوت آیا، اور اس نے اس کی جان لینی چاہی۔ اور نوراں کے پاؤں پر زخم آگئے۔ مگر وہ بچ گئی، کیونکہ وہ بروقت ہسپتال لائی گئی تھی۔ اور یہاں اس کا علاج شروع ہوگیا۔ آخر ہسپتال والے بھی انسان ہوتے ہیں۔ خوبصورتی دلوں پر اثر کرتی ہے، انجکشن کی طرح۔ تھوڑا بہت اس کا اثر ضرور ہوتا ہے۔ کسی پر کم کسی پر زیادہ۔ ڈاکٹر صاحب پر کم تھا۔ کمپونڈر پر زیادہ تھا۔ نوراں کی تیمارداری میں خلجی دل و جان سے لگا رہا۔ نوراں سے پہلے بیگماں، بیگماں سے پہلے ریشماں، اور ریشماں سے پہلے جانکی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا مگر وہ خلجی کے ناکام معاشقے تھے کیونکہ وہ عورتیں بیاہی ہوئی تھیں۔ ریشماں کا تو ایک بچہ بھی تھا، بچوں کے علاوہ ماں باپ تھے، اور خاوند تھے۔ اور خاوندوں کی دشمن نگاہیں تھیں۔ جو گویا خلجی کے سینے کے اندر

گھس کے اس کی خواہشوں کے آخری کونے تک پہنچ جانا چاہتی تھیں۔ خلجی کیا کر سکتا تھا۔ مجبور ہو کے رہ جاتا اس نے بیگماں سے عشق کیا۔ ریشماں سے اور جانکی سے بھی۔ وہ ہر روز بیگماں کے بھائی کو مٹھائی کھلاتا تھا۔ ریشماں کے ننھے بیٹے کو دن بھر اٹھائے پھرتا تھا۔ جانکی کو پھولوں سے بڑی محبت تھی۔ وہ ہر روز بڑی صبح اٹھ کے منہ اندھیرے جنگل کی طرف چلا جاتا۔ اور خوبصورت لالہ کے گچھے توڑ کر اس کے لیے لاتا۔ بہترین دوائیں، بہترین غذائیں، بہترین تیمار داری، لیکن وقت آنے پر جب بیگماں اچھی ہوئی تو روتے روتے اپنے خاوند کے ساتھ چلی گئی، اور جب ریشماں اچھی ہوئی تو اپنے بیٹے کو لے کے چلی گئی۔ اور جانکی اچھی ہوئی تو چلتے وقت اس نے خلجی کے دئیے ہوئے پھول اپنے سینے سے لگائے، اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور پھر اس نے اپنے خاوند کا ہاتھ تھام لیا اور چلتے چلتے گھاٹی کی اوٹ میں غائب ہو گئی۔ گھاٹی کے آخری کنارے پر پہنچ کر اس نے مڑ کر خلجی کی طرف دیکھا اور خلجی منہ پھیر کر وارڈ کی دیوار سے لگ کر رونے لگا ریشماں کے رخصت ہوتے وقت بھی وہ اسی طرح رویا تھا۔ بیگماں کے جاتے وقت بھی اسی شدت، اسی خلوص، اسی اذیت کے کربناک احساس سے مجبور ہو کر رو دیا تھا۔ لیکن خلجی کے لیے نہ ریشماں رکی، نہ بیگماں، نہ جانکی، اور پھر اب کتنے سالوں کے بعد نوراں آئی تھی۔ اور اس کا دل اسی طرح دھڑکنے لگا تھا، اور یہ دھڑکن روز بروز بڑھتی چلی جاتی تھی، شروع

شروع میں تو نوراں کی حالت غیر تھی، اس کا بچنا محال تھا، مگر خلجی کی انتھک کوششوں سے زخم بھرتے چلے گئے، پیپ کم ہوتی گئی، سرانڈ دور ہوتی گئی، سوجن غائب ہوتی گئی۔ نوراں کی آنکھوں میں چمک اور اس کے سپید چہرے پر صحت کی سرخی آتی گئی۔ اور جس روز خلجی نے اس کے بازوؤں کی پٹی اتاری تو نوراں بے اختیار اک اظہار تشکر کے ساتھ اس کے سینے سے لپٹ کر رونے لگی اور جب اس کے پاؤں کی پٹی اتری تو اس نے اپنے پاؤں میں مہندی رچائی اور ہاتھوں پر اور آنکھوں میں کاجل لگایا اور بالوں کی زلفیں سنواریں تو خلجی کا دل مسرت سے چوکڑیاں بھرنے لگا، نوراں خلجی کو دل دے بیٹھی تھی۔ اس نے خلجی سے شادی کا وعدہ کر لیا تھا۔ نمبردار کا بیٹا اور پٹواری کا بیٹا دونوں باری باری کئی دفعہ اسے دیکھنے کے لئے، اس سے معافی مانگنے کے لیے، اس سے شادی کا پیماں کرنے کے لیے ہسپتال آئے تھے۔

اور نوراں انھیں دیکھ کر ہر بار گھبرا جاتی، کانپنے لگتی، مڑ مڑ کے دیکھنے لگتی اور اس وقت تک اسے چین نہ آتا جب تک وہ لوگ چلے نہ جاتے اور خلجی اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں نہ لیتا، اور جب وہ بالکل اچھی ہو گئی تو سارا گاؤں اس کا اپنا گاؤں اسے دیکھنے کے لئے امڈ پڑا۔ گاؤں کی چھوری اچھی ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب اور کمپونڈر صاحب کی مہربانی سے، اور نوراں کے ماں باپ بچھے جاتے تھے، اور آج تو نمبردار بھی آیا تھا۔ اور پٹواری بھی۔ اور وہ دونوں خود مارغ

لڑکے بھی جو اب نوراں کو دیکھ دیکھ کے اپنے کیے پر پشیماں ہو رہے تھے، اور پھر نوراں نے اپنی ماں کا سہارا لیا۔ اور کاجل میں تیرتی ہوئی ڈبڈبائی آنکھوں سے خلجی کی طرف دیکھا۔ اور چپ چاپ اپنے گاؤں چلی گئی۔ سارا گاؤں اسے لینے کے لیے آیا تھا اور اس کے قدموں کے پیچھے پیچھے نمبردار کے بیٹے اور پٹواری کے بیٹے کے قدم تھے اور یہ قدم اور دوسرے قدم اور دوسرے قدم اور سینکڑوں قدم جو نوراں کے ساتھ چل رہے تھے۔ خلجی کے سینے کی گھاٹی پر سے گزرتے گئے، اور پیچھے ایک دھندلی گرد و غبار سے اٹی رہ گزر چھوڑ گئے۔

اور کوئی وارڈ کی دیوار کے ساتھ لگ کے سسکیاں لینے لگا۔

بڑی خوبصورت رومانی زندگی تھی خلجی کی، جو مڈل پاس تھا۔ بتیس روپے تنخواہ پاتا تھا۔ پندرہ بیس اوپر سے کما لیتا تھا۔ خلجی جو جوان تھا۔ جو محبت کرتا تھا، جو اک چھوٹے سے بنگلے میں رہتا تھا۔ جو اچھے ادیبوں کے افسانے پڑھتا تھا۔ اور عشق میں روتا تھا۔ کس قدر دلچسپ اور رومانی اور پر کیف زندگی تھی خلجی کی۔ لیکن کالو بھنگی کے متعلق میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ سوائے اس کے کہ :-

۱۔ کالو بھنگی نے بیگماں کی لہو اور پیپ سے بھری ہوئی پٹیاں دھوئیں۔

۲۔ کالو بھنگی نے بیگماں کا بول و براز صاف کیا۔

۳۔ کالو بھنگی نے ریشماں کی غلیظ پٹیاں صاف کیں۔

۴۔ کالو بھنگی ریشماں کے بیٹے کو مکّی کے بھٹے کھلاتا تھا۔

۵۔ کالو بھنگی نے جانکی کی گندی پٹیاں دھوئیں۔ اور ہر روز اس کے کمرے میں فینائل چھڑکتا رہا۔ اور شام سے پہلے وارڈ کی کھڑکی بند کرتا رہا، اور آتشدان میں لکڑیاں جلاتا رہا تاکہ جانکی کو سردی نہ لگے۔

۶۔ کالو بھنگی نوزاں کا پاخانہ اٹھاتا رہا۔ تین ماہ دس روز تک۔

کالو بھنگی نے ریشماں کو جاتے ہوئے دیکھا۔ اس نے جانکی کو جاتے ہوئے دیکھا، اس نے بیگماں کو جاتے ہوئے دیکھا، اس نے نوزاں کو جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ لیکن وہ کبھی دیوار سے لگ کر نہیں رویا۔ وہ پہلے تو دو ایک لمحوں کے لئے حیران ہو جاتا۔ پھر اسی حیرت سے اپنا سر کھجانے لگتا، اور جب کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آتی تو وہ ہسپتال کے نیچے کھیتوں میں چلا جاتا اور گائے سے اپنی چیندیا چٹوانے لگتا۔ لیکن اس کا ذکر تو میں پہلے کر چکا ہوں، پھر اور کیا لکھوں تمہارے بارے میں کالو بھنگی، سب کچھ تو کہہ دیا جو کچھ کہنا تھا۔ جو کچھ تم رہے ہو، تمہاری تنخواہ بتیس روپے ہوتی، تم مڈل پاس یا فیل، تمہیں وراثت میں کچھ کلچر، تہذیب، کچھ تھوڑی سی انسانی مسرت اور اس مسرت کی بلندی ملی ہوتی، تو میں تمہارے متعلق کوئی کہانی لکھتا۔ اب تمہارے آٹھ روپے

میں میں کیا کہانی لکھوں۔ ہر بار ان آٹھ روپوں کو الٹ پھیر کے دیکھتا ہوں۔ چار روپے کا آٹا، ایک روپے کا نمک، ایک روپے کا تمباکو، آٹھ آنے کی چائے، چار آنے کا گڑ، چار آنے کا مصالحہ، سات روپے، اور ایک روپیہ بنئے کا، آٹھ روپے ہو گئے۔ کیسے کہانی بنے گی تمہاری کالوبھنگی، تمہارا افسانہ مجھ سے نہیں لکھا جائے گا۔ چلے جاؤ، دیکھو میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔

مگر یہ منحوس ابھی تک یہیں کھڑا ہے۔ اپنے اکھڑے پیلے پیلے گندے دانت نکالے اپنی بھونڈی ہنسی ہنس رہا ہے۔

تو ایسے نہیں جائے گا، اچھا بھئی اب پھر میں اپنی یادوں کی راکھ کریدتا ہوں۔ شاید اب تیرے لئے مجھے بتیس روپوں سے نیچے اترنا پڑے گا۔ اور بختیار چپراسی کا آسرا لینا پڑے گا۔ بختیار چپراسی کو پندرہ روپے تنخواہ ملتی ہے۔ اور جب کبھی وہ ڈاکٹر یا کمپونڈر یا وکسی نیٹر کے ہمراہ دورے پر جاتا ہے تو اسے ڈبل بھتہ اور سفر خرچ بھی ملتا ہے۔ پھر گاؤں میں اس کی اپنی زمین بھی ہے۔ اور ایک چھوٹا سا مکان بھی ہے، جس کے تین طرف چیل کے بلند و بالا درخت ہیں۔ اور چوتھی طرف ایک خوبصورت سا باغیچہ ہے۔ جو اس کی بیوی نے لگایا ہے۔ اس میں اس نے کرم کا ساگ بویا ہے اور پالک اور مولیاں اور شلغم اور سبز مرچیں اور آلیں اور کدو، جو گرمیوں کی دھوپ میں سکھائے جاتے ہیں۔

اور سردیوں میں جب برف پڑتی ہے اور سبزہ مر جاتا ہے تو کھائے جاتے ہیں۔ بختیار کی بیوی یہ سب کچھ جانتی ہے۔ بختیار کے تین بچے ہیں۔ اس کی بوڑھی ماں ہے جو ہمیشہ اپنی بہو سے جھگڑا کرتی رہتی ہے۔ ایک دفعہ بختیار کی ماں اپنی بہو سے جھگڑا کر کے گھر سے چلی گئی تھی۔ اس روز گہرا ابر آسمان پر چھایا ہوا تھا۔ اور پالے کے مارے دانت بج رہے تھے، اور گھر سے بختیار کا بڑا لڑکا اماں کے چلے جانے کی خبر لے کر دوڑتا دوڑتا ہسپتال آیا تھا اور بختیار اسی وقت اپنی ماں کو واپس لانے کے لئے کالو بھنگی کو ساتھ لے کر چل دیا تھا۔ وہ دن بھر جنگل میں اسے ڈھونڈتے رہے۔ وہ اور کالو بھنگی اور بختیار کی بیوی جو اب اپنے کیے پر پشیماں تھی، اپنی ساس کو اونچی آوازیں دے دے کر روتی جاتی تھی۔ آسمان ابر آلود تھا اور سردی سے ہات پاؤں شل ہوئے جاتے تھے، اور پاؤں تلے چیل کے خشک جھومر پھسلے جاتے تھے، پھر بارش شروع ہو گئی۔ پھر کریڑی پڑنے لگی۔ اور پھر چاروں طرف گہری خاموشی چھا گئی۔ اور جیسے ایک گہری موت نے اپنے دروازے کھول دئیے ہوں۔ اور برف کی پریوں کو قطار ——— اندر قطار باہر زمین پر بھیج دیا ہو۔ برف کے گالے زمین پر گرتے گئے، ساکن، خاموش، بے آواز، سپید مخمل، گھاٹیوں، وادیوں، چوٹیوں پر پھیل گئے۔

”اماں“ بختیار کی بیوی زور سے چلائی۔

”اماں“ بختیار چلایا۔

"اماں" کالو بھنگی نے آواز دی۔

جنگل گونج کے خاموش ہو گیا۔

پھر کالو بھنگی نے کہا "میرا خیال ہے وہ نکر گئی ہوگی تمہارے ماموں کے پاس"

نکر کے دو کوس ادھر انھیں بختیار کی اماں ملی۔ برف گر رہی تھی اور وہ چلی جا رہی تھی۔ گرتی، پڑتی، لڑھکتی، تھمتی، ہانپتی کانپتی۔ آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اور جب بختیار نے اسے پکڑا تو اس نے ایک لمحے کے لئے مزاحمت کی، پھر وہ اس کے بازوؤں میں گر کر بے ہوش ہو گئی اور بختیار کی بیوی نے اسے تھام لیا۔ اور راستے بھر وہ اسے باری باری اٹھاتے چلے آئے۔ بختیار اور کالو بھنگی اور جب وہ لوگ واپس گھر پہنچے تو بالکل اندھیرا ہو چکا تھا اور انھیں واپس آتے دیکھکر بچے رونے لگے، اور کالو بھنگی ایک طرف ہو کے کھڑا ہو گیا۔ اور اپنا سر کھجلانے لگا۔ اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ اور وہاں سے چلا آیا۔ ہاں بختیار کی زندگی میں بھی افسانے ہیں، چھوٹے چھوٹے خوبصورت افسانے، مگر کالو بھنگی میں تمہارے متعلق اور کیا لکھ سکتا ہوں۔ میں ہسپتال کے ہر شخص کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھ سکتا ہوں، لیکن تمہارے متعلق اتنا کچھ کرید نے کے بعد بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارا کیا کیا جائے، خدا کے لئے اب تو چلے جاؤ بہت ستا لیا تم نے۔

لیکن مجھے معلوم ہے یہ نہیں جائے گا۔ اسی طرح میرے ذہن پر سوار رہے گا۔ اور میرے افسانوں میں اپنی غلیظ جھاڑو لئے کھڑا رہے گا۔ اب میں سمجھتا ہوں تو کیا چاہتا ہے، تو وہ کہانی سننا چاہتا ہے جو ہوئی نہیں لیکن ہو سکتی تھی، میں تیرے پاؤں سے شروع کرتا ہوں۔ سُن، تو چاہتا ہے نا کہ کوئی تیرے گندے کھردرے پاؤں دھو ڈالے دھو دھو کر ان سے غلاظت دور کرے۔ ان کی بیاؤں پر مرہم لگائے، تو چاہتا ہے، تیرے گھٹنوں کی ابھری ہوئی ہڈیاں گوشت میں چھپ جائیں، تیری رانوں میں طاقت اور سختی آجائے، تیرے پیٹ کی مرجھائی ہوئی سلوٹیں غائب ہو جائیں۔ تیرے کمزور سینے کے گرد و غبار سے اٹے ہوئے بال غائب ہو جائیں۔ تو چاہتا ہے کوئی تیرے ہونٹوں میں رس ڈال دے، انھیں گویائی بخش دے، تیری آنکھوں میں چمک ڈال دے، تیرے گالوں میں لہو بھر دے، تیری چندیا کو گھنے بالوں کی زلفیں عطا کرے، تجھے اک مصفّا لباس دیدے، تیرے اردگرد ایک چھوٹی سی چاردیواری کھڑی کر دے، حسین مصفّا پاکیزہ۔ اس میں تیری بیوی راج کرے۔ تیرے بچے قہقہے لگاتے پھریں، جو کچھ تو چاہتا ہے، وہ میں نہیں کرسکتا میں تیرے ٹوٹے پھوٹے دانتوں کی روتی ہوئی ہنسی پہچانتا ہوں۔

جب تو کائے سے اپنا سر چھوتا ہے مجھے معلوم ہے تو اپنے تخیل میں اپنی بیوی کو دیکھتا ہے جو تیرے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیر کر تیرا سر سہلا رہی ہے۔ حتیٰ کہ تیری آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ تیرا سر جھک

جاتا ہے اور تو اس کی مہربان آغوش میں سو جاتا ہے اور جب تو آہستہ آہستہ آگ پر میرے لئے مکّی کا بھٹّا سینکتا ہے اور مجھے جس محبّت اور شفقت سے وہ بھٹّا کھلاتا ہے تو اپنے ذہن کی پہنائی میں اس ننھّے بچّے کو دیکھ رہا ہوتا ہے جو تیرا بیٹا نہیں ہے جو ابھی نہیں آیا۔ جو تیری زندگی میں کبھی نہیں آئے گا۔ لیکن جس سے تو نے ایک شفیق باپ کی طرح پیار کیا ہے۔ تو نے اسے گودیوں میں کھلایا ہے، اس کا منہ چوما ہے اسے اپنے کندھے پر بٹھا کر، جہان بھر میں گھمایا ہے، دیکھ لو، یہ ہے میرا بیٹا، یہ ہے میرا بیٹا۔ اور جب یہ سب کچھ تجھے نہیں ملا تو تو سب سے الگ ہو کر کھڑا ہو گیا اور حیرت سے اپنا سر کھجانے لگا، اور تیری انگلیاں لاشعوری انداز میں گننے لگیں، ایک دو تین چار پانچ چھ سات آٹھ، آٹھ روپے، میں تیری وہ کہانی جانتا ہوں جو ہو سکتی تھی، لیکن ہو نہ سکی کیونکہ میں افسانہ نگار ہوں، میں ایک نئی کہانی گھڑ سکتا ہوں، اک نیا انسان نہیں گھڑ سکتا۔ اس کے لئے میں اکیلا کافی نہیں ہوں، اس کے لئے افسانہ نگار اور اس کا پڑھنے والا، اور ڈاکٹر، اور کمپونڈر، اور بھتیارے، اور گاؤں کے پٹواری اور نمبردار اور دوکاندار، اور حاکم، اور سیاست داں اور مزدور اور کھیتوں میں کام کرنے والے کسان، ہر شخص کی لاکھوں، کروڑوں، اربوں آدمیوں کی اکٹھی مدد چاہیئے۔ میں اکیلا مجبور ہوں، کچھ نہیں کر سکوں گا۔ جب تک ہم سب مل کر ایک دوسرے کی مدد نہ کریں گے یہ کام نہ ہوگا، اور تو اسی طرح اپنا جھاڑو لئے میرے

ذہن کے دروازے پر کھڑا رہے گا، اور میں کوئی عظیم افسانہ نہ لکھ سکوں گا، جس میں انسانی روح کی مکمل مسرت جھلک اٹھے، اور کوئی معمار عظیم عمارت تعمیر نہ کر سکے گا، جس میں ہماری قوم کی عظمت اپنی بلندیاں چھولے، اور کوئی ایسا گیت نہ گا سکے گا، جس کی پہنائیوں میں کائنات کی آفاقیت جھلک جھلک جائے۔

یہ بھرپور زندگی ممکن نہیں جب تک تو جھاڑو لئے یہاں کھڑا ہے!

اچھا ہے کھڑا رہ۔ پھر شاید وہ دن کبھی آجائے کہ کوئی تجھ سے تیری جھاڑو چھڑا دے، اور تیرے ہاتھوں کو نرمی سے تھام کر تجھے قوس قزح کے اس پار لے جائے!

جی آیا صاحب!

14/3/12

باورچی خانے کی دُھندلی فضا میں بجلی کا ایک اندھا قمقمہ چراغِ گور کی مانند اپنی سُرخ روشنی پھیلا رہا تھا۔ دھوئیں سے اٹی ہوئی دیواریں ہیبت ناک دیووں کی طرح انگڑائیاں لیتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ چبوترے پر بنی ہوئی انگیٹھیوں میں آگ کی آخری چنگاریاں اُبھر اُبھر کر اپنی موت کا ماتم کر رہی تھیں۔ ایک برقی چولھے پر رکھی ہوئی کیتلی کا پانی نہ معلوم کس چیز پر خاموش ہنس رہا تھا ——— دہ دہ کوئلے ہیں۔ پانی کے نل کے پاس ایک چھوٹی عمر کا لڑکا بیٹھا برتن صاف کرنے میں مشغول تھا ——— یہ انسپکٹر صاحب کا نوکر تھا۔

برتن صاف کرتے وقت یہ لڑکا گُنگنا رہا تھا۔ یہ لفظ تھے جو اس کی زبان سے بغیر کسی کوشش کے نکل رہے تھے۔

"جی آیا صاحب! جی آیا صاحب! ——— بس ابھی صاف ہو جاتے ہیں صاحب"

ابھی برتنوں کو راکھ سے صاف کرنے کے بعد انھیں پانی سے دھو کر قرینے سے رکھنا بھی تھا اور یہ کام جلدی سے نہ ہو سکتا تھا۔ لڑکے کی آنکھیں نیند سے بند ہوئی جا رہی تھیں۔ سر سخت بھاری ہو رہا تھا مگر کام کیے بغیر آرام ——— یہ کیوں کر ممکن تھا؟ برقی چولھا بدستور ایک شور کے ساتھ نیلے شعلوں کو اپنے حلق سے اُگل رہا تھا۔ کیتلی کا پانی اسی انداز میں کِھلکِھلا کر ہنس رہا تھا۔

دفعتاً لڑکے نے نیند کے ناقابل مغلوب حملے کو محسوس کرتے ہوئے اپنے جسم کو ایک جنبش دی اور "جی آیا صاحب، جی آیا صاحب" گنگناتا ہوا پھر کام میں مشغول ہو گیا۔

دیوار گیروں پر چُنے ہوئے برتن اس لڑکے کو ایک غیر مختتم ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے تھے۔ پانی کے نل سے روزانہ ایک ہی واقعہ کو دیکھ کر قطروں کی صورت میں آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ بجلی کا قُمقمہ حیرت سے اس لڑکے کی جانب دیکھ رہا تھا ——— کمرے کی فضا سِسکیاں بھرتی ہوئی معلوم دے رہی تھی۔

"قاسم ——— قاسم!"

"جی آیا صاحب" لڑکا جو ابھی الفاظ کی گردان کر رہا تھا، بھاگتا ہوا اپنے آقا کے پاس گیا۔

انسپکٹر صاحب نے کمبل سے منہ نکالا اور لڑکے پر خفا ہوتے ہوئے کہا:—

"بے وقوف کے بچے! آج پھر یہاں صراحی اور گلاس رکھنا بھول گیا ہے۔"

"ابھی لایا صاحب۔ ابھی لایا صاحب۔"

کمرے میں صُراحی اور گلاس رکھنے کے بعد وہ ابھی برتن صاف کرنے کے لئے بیٹھا ہی تھا کہ پھر اُس کمرے سے آواز آئی:۔

"قاسم۔ قاسم!"

"جی آیا صاحب۔" قاسم بھاگتا ہوا اپنے آقا کے پاس گیا۔

"بمبئی کا پانی کس قدر خراب ہے۔ جاؤ پارسی کے ہوٹل سے سوڈا لے کر آؤ۔ بس بھاگے ہوئے جاؤ۔ سخت پیاس لگ رہی ہے۔"

"بہت اچھا صاحب۔"

قاسم بھاگتا ہوا گیا اور پارسی کے ہوٹل سے جو گھر سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر واقع تھا، سوڈے کی بوتل لے آیا اور اپنے آقا کو گلاس میں ڈال کر دے دیا۔

"اب تم جاؤ، مگر اس وقت تک کیا کر رہے ہو۔ برتن صاف نہیں ہوئے کیا؟"

"ابھی صاف ہو جاتے ہیں صاحب۔"

"اور ہاں، برتن صاف کرنے کے بعد میرے سیاہ بوٹ کو پالش کر دینا مگر دیکھنا احتیاط رہے۔ چمڑے پر کوئی خراش نہ آئے۔

ورنہ ــــــــ"

قاسم کو "ورنہ" کے بعد کا جملہ بخوبی معلوم تھا۔" بہت اچھا صاحب" کہتے ہوئے وہ باورچی خانہ میں واپس چلا گیا اور برتن صاف کرنے شروع کر دیئے۔

اب نیند اس کی آنکھوں میں سمٹی چلی آ رہی تھی — پلکیں آپس میں ملی جا رہی تھیں۔ سر میں سیسہ اُتر رہا تھا ــــــــ یہ خیال کرتے ہوئے کہ صاحب کے بوٹ بھی ابھی پالش کرنے ہیں" قاسم نے اپنے سر کو زور سے جنبش دی اور وہی راگ الاپنا شروع کر دیا:—

"جی آیا صاحب، جی آیا صاحب! بوٹ ابھی صاف ہوئے جاتے ہیں صاحب"

مگر نیند کا طوفان ہزار بند باندھنے پر بھی نہ رُکا۔ اب اسے محسوس ہونے لگا کہ نیند ضرور غلبہ پا کر رہے گی۔ لیکن ابھی برتنوں کو دھو کر انھیں اپنی جگہ پر رکھنا باقی تھا۔ اس وقت ایک عجیب خیال اس کے دماغ میں آیا " بھاڑ میں جائیں برتن — اور چولھے میں جائیں بوٹ — کیوں نہ تھوڑی دیر اسی جگہ پر سو جاؤں اور پھر چند لمحات آرام کرنے کے بعد ــــــــ"

اس خیال کو باغیانہ تصوّر کرتے ہوئے قاسم نے ترک کر دیا اور برتنوں پر جلدی جلدی راکھ ملنا شروع کر دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد جب نیند پھر غالب آئی تو اس کے جی میں آیا کہ اُبلتا ہوا پانی اپنے سر پر اُنڈیل لے اور اس طرح اس غیر مرئی طاقت سے جو اس کام میں حارج ہو رہی تھی نجات پا جائے ——— مگر اتنا حوصلہ نہ پڑا۔

بصد مشکل منہ پر پانی کے چھینٹے مار مار کر اس نے سب برتنوں کو بالآخر صاف کر ہی لیا۔ یہ کام کرنے کے بعد اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب وہ آرام سے سو سکتا تھا اور نیند ——— ——— وہ نیند جس کے لئے اس کی آنکھیں اور دماغ اس شدت سے انتظار کر رہے تھے، اب بالکل نزدیک تھی۔

باورچی خانے کی روشنی گُل کرنے کے بعد قاسم نے باہر برآمدے میں اپنا بستر بچھایا اور لیٹ گیا اور اس سے پہلے کہ نیند اسے اپنے آرام دہ بازوؤں میں تھام لے، اس کے کان "بوٹ بوٹ" کی آواز سے گونج اٹھے۔

"بہت اچھا صاحب ——— ابھی پالش کرتا ہوں"

بڑبڑاتا ہوا قاسم بستر سے اٹھا جیسے اس کے آقا نے ابھی بوٹ روغن کرنے کے لئے حکم دیا ہے۔

ابھی قاسم بوٹ کا ایک پیر بھی اچھی طرح پالش نہ کرنے پایا تھا کہ نیند کے غلبے نے اُسے وہیں سُلا دیا۔

سورج کی خونیں کرنیں اس مکان کے شیشوں سے نمودار ہوئیں

——— قاسم کی کتابِ حیات میں ایک اور پُر از مشقت باب کا اضافہ ہو گیا۔

صبح جب انسپکٹر صاحب نے اپنے نوکر کو باہر برآمدے میں بوٹوں کے پاس سویا ہوا دیکھا تو اسے ٹھوکر مار کر جگاتے ہوئے کہا "یہ سوّر کی طرح یہاں بے ہوش پڑا ہوا ہے اور مجھے خیال تھا کہ اس نے بوٹ صاف کر لئے ہوں گے۔

"——— نمک حرام! ——— ابے قاسم!"

"جی آیا صاحب"

قاسم کے منہ سے اتنا ہی نکلا تھا کہ اس نے اپنے ہاتھ میں بوٹ صاف کرنے کا برش دیکھا۔ فوراً ہی اس معاملہ کو سمجھتے ہوئے اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا:—

"میں سو گیا تھا صاحب! مگر—بوٹ ابھی پالش ہو جاتے ہیں صاحب" یہ کہتے ہوئے اس نے جلدی جلدی بوٹ کو برش سے رگڑنا شروع کر دیا۔

بوٹ پالش کرنے کے بعد اس نے اپنا بستر تہہ کیا اور اُسے اوپر کے کمرے میں رکھنے چلا گیا۔

"قاسم—!"

قاسم بھاگا ہوا نیچے آیا اور اپنے آقا کے پاس کھڑا ہو گیا۔

"دیکھو! آج ہمارے یہاں مہمان آئیں گے — اس لئے

باورچی خانے کے تمام برتن اچھی طرح صاف رکھنا ——— فرش بھی دھلا ہوا ہونا چاہیئے۔ اس کے علاوہ تمہیں ملاقاتی کمرے کی تصویروں، میزوں اور کرسیوں کو بھی صاف کرنا ہوگا۔ سمجھے! مگر خیال رہے میری میز پر ایک تیز دھار چاقو پڑا ہوا ہے، اسے مت چھیڑنا! میں اب دفتر جا رہا ہوں مگر یہ کام دو گھنٹے سے پہلے ہو جانا چاہیئے۔"

"بہت بہتر صاحب!"

انسپکٹر صاحب دفتر چلے گئے۔ قاسم باورچی خانہ صاف کرنے میں مشغول ہو گیا۔

ڈیڑھ گھنٹے کی ان تھک محنت کے بعد اس نے باورچی خانے کے تمام کام کو ختم کر دیا اور ہاتھ پاؤں صاف کرنے کے بعد جھاڑن لے کر ملاقاتی کمرے میں چلا گیا۔

وہ ابھی کرسیوں کو جھاڑن سے صاف کر رہا تھا کہ اس کے تھکے ہوئے دماغ میں ایک تصویر سی کھنچ گئی۔ کیا دیکھتا ہے کہ اس کے گرد و پیش برتن ہی برتن پڑے ہیں اور پاس ہی راکھ کا ایک ڈھیر لگ رہا ہے۔ ہوا زوروں پر چل رہی ہے جس سے راکھ اُڑ اُڑ کر فضا کو خاکستر بنا رہی ہے۔ یکایک اس ظلمت میں ایک سرخ آفتاب نمودار ہوا جس کی کرنیں خون آشام برچھیوں کی طرح ہر برتن کے سینے میں گھس گئیں۔ زمین خون سے شرابور ہو گئی ———

فضا خوشی کے قہقہوں سے معمور ہو گئی۔

قاسم یہ منظر دیکھ کر گھبرا گیا اور اس وحشت ناک خواب سے بیدار ہو کر "جی آیا صاحب، جی آیا صاحب" کہتا ہوا پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد اس کی آنکھوں کے سامنے ایک اور منظر رقص کرنے لگا۔ اب اس کے سامنے چھوٹے چھوٹے لڑکے آپس میں کوئی کھیل کھیل رہے تھے۔ دفعتاً آندھی چلنی شروع ہوئی جس کے ساتھ ہی ایک بدنما اور بھیانک دیو نمودار ہوا، جو ان سب بچوں کو نگل گیا ———

——— قاسم نے خیال کیا کہ وہ دیو اس کے آقا کے ہم شکل تھا۔ گو قدوقامت کے لحاظ سے وہ اس سے کہیں بڑا تھا۔ اب اس دیو نے زور زور سے ڈکارنا شروع کیا۔ قاسم سر سے پیر تک لرز گیا۔

ابھی تمام کمرہ صاف کرنا تھا اور وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ چناں چہ قاسم نے جلدی جلدی کرسیوں پر جھاڑن مارنا شروع کر دیا۔ ابھی وہ کرسیوں کا کام ختم کرنے کے بعد میز صاف کرنے جا رہا تھا کہ اُسے یکایک خیال آیا "آج مہمان آ رہے ہیں۔ خدا معلوم کتنے برتن صاف کرنے پڑیں گے اور یہ نیند کم بخت کتنی ستا رہی ہے ——— مجھ سے تو کچھ بھی نہ ہو سکے گا"

یہ سوچتے وقت وہ میز پر رکھی چیزوں کو پوچھ رہا تھا کہ اچانک اُسے قلم دان کے پاس ایک کھُلا ہوا چاقو نظر آیا ——— وہی چاقو جس کے متعلق اس کے آقا نے کہا تھا کہ بہت تیز ہے۔

چاقو دیکھنا تھا کہ اس کی زبان پر خود بخود یہ لفظ جاری ہو گئے ——— "چاقو ——— تیز دھار چاقو! ——— یہی تمہاری مصیبت کو ختم کر سکتا ہے"

کچھ اور سوچے بغیر قاسم نے تیز دھار چاقو اٹھا اپنی انگلی پر پھیر لیا ——— اب وہ شام کے وقت برتن صاف کرنے کی زحمت سے بہت دور تھا اور نیند ——— پیاری نیند اب اُسے بہ آسانی نصیب ہو سکتی تھی۔

انگلی سے خون کی سُرخ دھار بہہ رہی تھی۔ سامنے والی دوات کی سُرخ روشنائی سے کہیں چمکیلی۔ قاسم اس خون کی دھار کو مسرت بھری آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور منہ میں یہ گنگنا رہا تھا۔ "نیند، نیند ——— پیاری نیند"

تھوڑی دیر کے بعد وہ بھاگا ہوا اپنے آقا کی بیوی کے پاس گیا جو زنان خانے میں بیٹھی سلائی کر رہی تھی۔ وہ اپنی زخمی انگلی کو دکھا کر کہنے لگا۔ "دیکھئے بی بی جی!"

"ارے قاسم یہ تو نے کیا کیا؟ ——— کم بخت صاحب کے چاقو کو چھیڑا ہو گا تو نے"

"بی بی جی — ! بس میز صاف کر رہا تھا اور اس نے کاٹ کھایا" قاسم ہنس پڑا۔

"ابے سوّر اب ہنستا ہے۔ اِدھر آ" میں اس پر کپڑا باندھ دوں ——— مگر اب بتا تو سہی، آج یہ برتن تیرا باپ صاف کرے گا؟"

قاسم اپنی فتح پر زیر لب مسکرا رہا تھا۔

انگلی پر پٹی بندھوا کر قاسم پھر کمرے میں گیا اور میز پر پڑے ہوئے خون کے دھبوں کو صاف کرنے کے بعد خوشی خوشی اپنا کام ختم کر دیا۔

"اب اس نمک حرام باورچی کو برتن صاف کرنے ہوں گے ——— اور ضرور صاف کرنے ہوں گے ——— کیوں میاں مٹھو؟" — قاسم نے انتہائی مسرّت میں کھڑکی میں لٹکے ہوئے طوطے سے دریافت کیا۔

شام کے وقت مہمان آئے اور چلے گئے۔ باورچی خانے میں صاف کرنے والے برتنوں کا ایک طومار سا لگ گیا ———

انسپکٹر صاحب قاسم کی زخمی انگلی دیکھ کر بہت برسے اور جی کھول کر گالیاں دیں، مگر اُسے مجبور نہ کر سکے ——— شاید اس لئے کہ ایک بار اُن کی اپنی انگلی میں قلم تراش کی نوک چبھ جانے سے بہت درد محسوس ہوا تھا۔

آقا کی خفگی آنے والی مسرت نے بھلا دی اور قاسم کودتا پھاندتا ہوا اپنے بستر پر جا لیٹا۔ تین چار روز تک وہ برتن صاف کرنے کی زحمت سے بچا رہا ———— مگر اس کے بعد انگلی کا زخم بھر آیا ———— اب پھر وہی مصیبت نمودار ہو گئی۔

"قاسم — صاحب کی جرابیں اور قمیص دھو ڈالو"

"بہت اچھا بی بی جی"

"قاسم! اس کمرے کا فرش کتنا بدنما ہو رہا ہے۔ پانی لاکر ابھی صاف کرو۔ دیکھنا کوئی داغ دھبّہ باقی نہ رہے"

"بہت اچھا صاحب"

"قاسم! شیشے کے گلاس کتنے چکنے ہو رہے ہیں۔ انھیں نمک سے صاف کرو۔

"جی اچھا صاحب"

"قاسم! طوطے کا پنجرا کس قدر غلیظ ہو رہا ہے، اسے صاف کیوں نہیں کرتے —؟"

"ابھی کرتا ہوں بی بی جی"

"قاسم! ابھی خاکروب آتا ہے۔ تم پانی ڈالنے جانا، وہ سیڑھیوں کو دھو ڈالے گا"

"بہت اچھا صاحب"

"قاسم! ذرا بھاگ کے ایک آنہ کا دہی تو لے آنا"

"ابھی چلائی بی جی"

پانچ چھ روز اسی قسم کے احکام سننے میں گذر گئے۔ قاسم کام کی زیادتی اور آرام کے قحط سے تنگ آگیا۔ ہر روز اسے نصف شب تک کام کرنا پڑتا اور پھر علی الصباح چار بجے کے قریب بیدار ہو کر ناشتہ کے لئے چائے تیار کرنا پڑتی۔ یہ کام قاسم کی عمر کے لڑکے کے لئے بہت زیادہ تھا۔

ایک روز انسپکٹر صاحب کی میز صاف کرتے کرتے اس کے ہاتھ خود بخود چاقو کی طرف بڑھے ——— اور ایک لمحہ کے بعد اس کی انگلی سے خون بہہ رہا تھا ——— انسپکٹر صاحب اور ان کی بیوی قاسم کی یہ حرکت دیکھ کر بہت خفا ہوئے۔ چناں چہ سزا کی صورت میں اسے شام کا کھانا نہ دیا گیا مگر وہ اپنی ایجاد کردہ ترکیب کی خوشی میں مگن تھا ——— ایک وقت روٹی نہ ملی۔ انگلی پر معمولی سا زخم آگیا مگر برتنوں کا انبار صاف کرنے سے نجات مل گئی ——— یہ سودا کچھ بُرا نہ تھا۔

چند دنوں کے بعد اس کی انگلی کا زخم ٹھیک ہوگیا۔ اب پھر کام کی وہی بھرمار شروع تھی ——— پندرہ بیس روز گدھوں کی سی مشقت میں گذر گئے۔ اس عرصے میں قاسم نے بارہا ارادہ کیا کہ چاقو سے پھر اپنی انگلی زخمی کرے، مگر اب میز پر سے وہ چاقو اٹھا لیا گیا اور باورچی خانے والی چھُری کُند تھی۔

ایک روز باورچی بیمار پڑ گیا۔ اب اُسے ہر وقت باورچی خانے میں موجود رہنا پڑتا۔ کبھی مرچیں پیستا۔ کبھی آٹا گوندھتا۔ کبھی کوئلوں کو ہوا دیتا۔ غرض صبح سے لے کر آدھی رات تک اس کے کانوں میں "اے قاسم یہ کر، اے قاسم وہ کر" کی صدا گونجتی رہتی۔

باورچی دو روز تک نہ آیا۔ قاسم کی ننھی جان اور ہمت جواب دے گئی، مگر سوائے کام کے اور چارہ ہی کیا تھا؟

ایک روز اس کے آقا نے اُسے الماری صاف کرنے کو کہا۔ جس میں ادویات کی شیشیاں اور مختلف چیزیں پڑی ہوئی تھیں۔ الماری صاف کرتے وقت اسے ڈاڑھی مونڈنے کا ایک بلیڈ نظر آیا۔ بلیڈ کو پکڑتے ہی اس نے اپنی انگلی پر پھیر لیا۔ دھار تھی بہت تیز اور باریک۔ انگلی میں دور تک چلا گیا۔ جس سے بہت بڑا زخم بن گیا۔

قاسم نے بہت کوشش کی کہ خون نکلنا بند ہو جائے، مگر زخم کا مُنہ بڑا تھا۔ وہ نہ تھما۔ سیروں خون پانی کی طرح بہہ گیا۔ یہ دیکھ کر قاسم کا رنگ کاغذ کی مانند سپید ہو گیا۔ بھاگا ہوا اپنے آقا کی بیوی کے پاس گیا۔ "بی بی جی! میری انگلی میں صاحب کا اُسترا لگ گیا ہے!"

جب انسپکٹر صاحب کی بیوی نے قاسم کی انگلی کو تیسری مرتبہ زخمی دیکھا فوراً معاملے کو سمجھ گئی۔ چُپ چاپ اٹھی اور کپڑا نکال کر اس کی انگلی پر باندھ دیا اور کہا "قاسم! اب تم ہمارے گھر میں نہیں رہ سکتے۔"

”وہ کیوں بی بی جی ؟“

”یہ صاحب سے دریافت کرنا“

صاحب کا نام سنتے ہی قاسم کا رنگ اور بھی سپید پڑ گیا۔

چار بجے کے قریب انسپکٹر صاحب دفتر سے گھر آئے اور اپنی بیوی سے قاسم کی نئی حرکت سُن کر اُسے فوراً اپنے پاس بُلا لیا۔

”کیوں میاں! یہ انگلی ہر روز زخمی کرنے کے کیا معنی ہیں —— ؟“ —— قاسم خاموش کھڑا رہا۔

”تم نوکر ہو کر یہ سمجھتے ہو کہ ہم لوگ اندھے ہیں اور ہمیں بار بار دھوکہ دیا جا سکتا ہے۔ اب اپنا بوریا بستر دبا کر ناک کی سیدھ میں یہاں سے بھاگ جاؤ، ہمیں تم جیسے نوکروں کی کوئی ضرورت نہیں —— سمجھے —— ؟“

”مگر —— صاحب!“

”صاحب کا بچہ —— بھاگ جا یہاں سے۔ تیری بقایا تنخواہ کا ایک پیسہ بھی نہیں دیا جائے گا —— اب میں اور کچھ نہیں سُننا چاہتا“

قاسم روتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ طوطے کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ طوطے نے بھی خاموشی میں اسے کچھ کہا اور اپنا بستر لے کر وہ سیڑھیوں سے نیچے اُتر گیا، مگر دفعتاً کچھ خیال آیا اور بھاگا ہوا اپنے آقا کی بیوی کے پاس گیا اور درد انگیز آواز میں اتنا کہہ کر ”سلام بی بی جی! —— میں ہمیشہ کے لئے آپ سے رخصت ہوتا ہوں“

——— وہاں سے رخصت ہو گیا۔

*　　*　　*

خیراتی ہسپتال میں ایک نوخیز لڑکا درد کی شدت سے لوہے کی پلنگ پر کروٹیں بدل رہا ہے۔ پاس ہی دو ڈاکٹر بیٹھے ہیں۔

اُن میں سے ایک ڈاکٹر اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا —" زخم خطرناک صورت اختیار کر گیا ——— ہاتھ کاٹنا پڑے گا "

" بہت بہتر " ——— یہ کہتے ہوئے دوسرے ڈاکٹر نے نوٹ بک میں اس مریض کا نام درج کر لیا ———

ایک چوبی تختی پر جو چارپائی کے سرہانے لٹکی ہوئی تھی ——— مندرجہ ذیل الفاظ لکھے تھے ———

نام :- محمد قاسم ولد عبد الرحمٰن (مرحوم)۔

عمر :- دس سال۔

گرہن

رُوپو، شبو، کھتو اور مُنّا ــــــ ہولی نے اساڑھی کے کائستھوں کو چار بچے دیئے تھے اور پانچواں چند ہی مہینوں میں جننے والی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے پڑنے لگے، گالوں کی ہڈیاں اُبھر آئیں اور گوشت ان میں پچک گیا۔ وہ ہولی جسے پہلے پہل بیا پیارے چاند رانی کہہ کر پکارا کرتی تھی اور جس کی صحت اور سندرتا کا رسیلا حاسد تھا گرے ہوئے پتے کی طرح زرد اور پژمردہ ہو چکی تھی۔

آج رات گرہن تھا۔ سرِ شام چاند گرہن کے زمرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ ہولی کو اجازت نہ تھی کہ وہ کوئی کپڑا پھاڑ سکے ــــــ پیٹ میں بچے کے کان پھٹ جائیں گے، وہ سی نہ سکتی تھی ــــــ منہ سلا بچہ پیدا ہو گا۔ اپنے میکے خط نہ لکھ سکتی تھی ــــــ اس کے ٹیڑھے میڑھے حروف بچے کے چہرے پر لکھے جائیں گے، اور اپنے میکے خط لکھنے کا اسے بڑا چاؤ تھا۔

میکے کا نام آتے ہی اس کا تمام جسم ایک نامعلوم جذبے سے کانپ اُٹھتا۔ وہ میکے تھی تو اسے سُسرال کا کتنا چاؤ تھا لیکن اب وہ سُسرال سے اتنی سیر

ہو چکی تھی کہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ اس بات کا اس نے کئی مرتبہ تہیہ بھی کیا لیکن ہر دفعہ ناکام رہی۔ اس کے میکے اسماڑھی گاؤں سے پچیس میل کے فاصلے پر تھے۔ سمندر کے کنارے ہر پھول بندر پر شام کے وقت سٹیمر لانچ مل جاتا تھا۔ اور ساحل کے ساتھ ساتھ ڈیڑھ دو گھنٹے کی مسافت کے بعد اسکے میکے گاؤں کے بڑے مندر کے زنگ خوردہ کلس دکھائی دینے لگتے۔

آج شام ہونے سے پہلے روٹی، چوکا، برتن کے کام سے فارغ ہونا تھا۔ میّا کہتی تھی گرہن سے پہلے روٹی وغیرہ کھا لینی چاہئے ورنہ ہر حرکت پیٹ میں بچے پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اثر انداز ہوتی ہے۔ گویا وہ بدزیب، فراخ نتھنوں والی ہٹیلی میّا اپنی بہو حمیدہ بانو کے پیٹ سے کسی اکبر اعظم کی متوقع ہے، چار بچوں، تین مردوں، دو عورتوں، چار بھینسوں پر مشتمل بڑا کنبہ اور اکیلی ہولی —— دوپہر تک تو ہولی برتنوں کا انبار صاف کرتی رہی، پھر جانوروں کے لئے بنولے، کھلی اور چنے بھگونے چلی۔ حتیٰ کہ اس کے کولھے درد سے پھٹنے لگے اور بغاوت پسند بچہ پیٹ میں اپنی بے بضاعت مگر ہولی کو تڑپا دینے والی حرکتوں سے احتجاج کرنے لگا۔ ہولی شکست کے احساس سے چوکی پہ بیٹھ گئی۔ لیکن وہ بہت دیر تک چوکی یا فرش پہ بیٹھنے کے قابل نہ تھی اور پھر میّا کے خیال کے مطابق چوڑی چکلی چوکی پہ بہت دیر بیٹھنے سے بچے کا سر چپٹا ہو جاتا ہے۔ مونڈھا ہو تو اچھا ہے۔ کبھی کبھی ہولی میّا اور کاستھوں کی آنکھ بچا کر کھاٹ پر سیدھی پڑ جاتی اور ایک پرشکم کتیا کی طرح ٹانگوں کو اچھی طرح سے پھیلا کر جمائی لیتی اور پھر اسی وقت کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنے ننھے سے دوزخ کو سہلانے لگتی۔

یہ خیال کرنے سے کہ وہ سیتل کی بیٹی ہے، وہ اپنے آپ کو روک نہ سکتی تھی۔ سیتل سارنگ دیوگرام کا ایک متمول ساہوکار تھا اور سارنگ دیوگرام کے نواح کے بیس گاؤں کے کسان اس سے بیاج پر روپیہ لیتے تھے۔ اس کے باوجود اسے کائستھوں کے ہاں ذلیل کیا جاتا تھا۔ ہولی کے ساتھ کتوں سے بھی برا سلوک ہوتا تھا۔ کائستھوں کو بچے چاہئیں، ہولی جہنم میں جائے۔ گویا سارے گجرات میں یہ کائستھ ہی کُل وِدھو (کُل کو بڑھانیوالی ـــــ بہو) کا صحیح مطلب سمجھتے تھے۔

ہر سال ڈیڑھ سال کے بعد وہ ایک نیا کیڑا گھر میں رینگتا ہوا دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ اور بچے کی وجہ سے کھایا پیا ہولی کے جسم پر اثر انداز نہیں ہوتا تھا۔ شاید اسے روٹی بھی اسی لئے دی جاتی تھی کہ پیٹ میں بچہ مانگتا ہے اور اسی لئے اسے حمل کے شروع میں چاٹ اور اب پھل آزادانہ دیئے جاتے تھے۔

"دیور ہے تو وہ الگ پیٹ لیتا ہے۔" ہولی سوچتی "اور ساس کے کوسنے اور مار پیٹ سے کہیں برے ہیں اور بڑے کائستھ جب ڈانٹنے لگتے ہیں تو پاؤں تلے سے زمین نکل جاتی ہے۔ ان سب کو بھلا میری جان لینے کا کیا حق ہے؟...
رسیلا کی تو بات ہی دوسری ہے، شاستروں نے اسے پرماتما کا درجہ دیا ہے۔ وہ جس چھری سے مارے اُس چھری کا بھلا!...... لیکن کیا شاستر کسی عورت نے بنائے ہیں؟ اور میا کی تو بات ہی علیحدہ ہے ـــــ شاستر کسی عورت نے لکھے ہوتے تو وہ اپنی ہم جنس پر اس سے بھی زیادہ پابندیاں عائد کرتی..."

...... راہو اپنے نئے بھیس میں نہایت اطمینان سے امرت پی رہا تھا

چاند سورج نے وشنو مہاراج کو اس کی اطلاع دی اور بھگوان نے سدرشن سے راہو کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ اس کا سر اور دھڑ دونوں آسمان پر جا کر راہو اور کیتو بن گئے۔ سورج اور چاند دونوں ان کے مقروض ہیں۔ اب وہ ہر سال دو مرتبہ چاند اور سورج سے بدلہ لیتے ہیں اور ہولی سوچتی تھی۔ بھگوان کے کھیل بھی نیارے ہیں...... اور راہو کی شکل کیسی عجیب ہے، ایک کالا راکشش، شیر پہ چڑھا ہوا، دیکھ کر کتنا ڈر لگتا ہے۔ رسیلا بھی تو شکل سے راہو ہی دکھائی دیتا ہے۔ منا کی پیدائش پر ابھی چالیسواں بھی نہ نہائی تھی تو آموجود ہوا ——

کیا میں نے بھی اس کا قرض دینا ہے؟

اس وقت ہولی کے کانوں میں ماں بیٹے کے آنے کی بھنک پڑی۔ ہولی نے دونوں ہاتھوں سے پیٹ کو سنبھالا اور اُٹھ کھڑی ہوئی اور جلدی سے توے کو دھیمی دھیمی آنچ پر رکھ دیا۔ اب اس میں جھکنے کی تاب نہ تھی کہ پھونکیں مار کر آگ جلا سکے۔ اس نے کوشش بھی لیکن اس کی آنکھیں پھٹ کر باہر آتے لگیں۔

رسیلا ایک نیا مرمت کیا ہوا چھاج ہاتھ میں لئے اندر داخل ہوا۔ اس نے جلدی سے ہاتھ دھوئے اور مُنہ دھوئے اور مُنہ سے کچھ بڑبڑانے لگا۔ اس کے پیچھے میا آئی اور آتے ہی بولی۔

”بہو...... اناج رکھا ہے کیا؟“

”تو بیٹھی کر کیا رہی ہے نواب جادی؟“

ہولی نے رحم جویانہ نگاہوں سے رسیلے کی طرف دیکھا اور بولی ”جی! مجھے اناج کی بوری ہلائی جاتی ہے کہیں؟“

میا لاجواب ہو گئی۔ اور یوں بھی اسے ہولی کی نسبت اس کے پیٹ میں بچے کی زیادہ پرواہ تھی۔ شاید اسی لئے ہولی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولی

"تو نے سُرمہ کیوں لگایا ہے ری؟ —— رانڈ جانتی بھی ہے آج گہن ہے یو بچہ اندھا ہو جائے تو تیرلے ایسی بیسوا اسے پالنے چلے گی؟"

ہولی چُپ ہو گئی اور نظریں زمین پر گاڑے ہوئے مُنہ میں کچھ بڑبڑاتی گئی۔ اور سب ہو جائے لیکن رانڈ کی گالی اس کی برداشت سے باہر تھی۔ اسے بڑبڑاتے دیکھ کر میا اور بھی بکتی جھکتی چابیوں کا گچھا تلاش کرنے لگی۔ ایک میلے شمع دان کے قریب سُرمہ پیسنے کا کھرل رکھا ہوا تھا۔ اس میں سے چابیوں کا گچھا نکال کر وہ بھنڈارے کی طرف چلی گئی۔ رسیلے نے ایک پُر ہوس نگاہ سے ہولی کی طرف دیکھا۔ اس وقت ہولی اکیلی تھی۔ رسیلے نے آہستہ سے آنچل کھینچا کو چھوا ہولی نے ڈرتے ڈرتے دامن جھٹک دیا اور اپنے دیور کو آوازیں دینے لگی۔ گویا دوسرے آدمی کی موجودگی چاہتی ہے۔ اس کیفیت میں مرد کو ٹھکرا دینا معمولی بات نہیں ہوتی۔ رسیلا آواز کو چیلتے ہوئے بولا۔

"میں پوچھتا ہوں بھلا اتنی جلدی کا ہے کی تھی؟"

"جلدی کیسی؟"

رسیلا پیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "یہی ...... تم بھی تو کیتیا ہو کیتیا!"

ہولی سہم کر بولی "تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

ہولی نے نادانستگی میں رسیلے کو وحشی، بد چلن، ہوس ران سبھی کچھ کہہ دیا۔

چوٹ سیدھی پڑی، رسیلا کے پاس اس کا کوئی کوئی جواب نہ تھا۔ لاجواب آدمی کا جواب چپت، ہوتی ہے اور دوسرے لمحے میں انگلیوں کے نشان ہولی کے گالوں پر دکھائی دینے لگے۔

اس وقت میا ماش کی ایک ٹوکری اُٹھائے ہوئے بھنڈارے کی طرف سے آئی اور بہو سے بدسلوکی کرنے کی وجہ سے بیٹے کو جھڑکنے لگی۔ ہولی کو رسیلے پر تو غصّہ نہ آیا، البتہ میاّ کی اس عادت سے جل بھُن گئی ——— "رانڈ، آپ مارے تو اس سے بھی جیادہ، اور جو بیٹا کچھ کہے تو ہمدردی جتاتی ہے، بڑی آئی ہے...."

ہولی سوچتی تھی کہ کل رسیلے نے مجھے اس لئے مارا تھا میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ اور آج اس لئے مارا ہے کہ میں نے بات کا جواب دیدیا ہے۔ میں جانتی ہوں وہ مجھ سے کیوں ناراض ہے، کیوں گالیاں دیتا ہے، میرے کھانے پہنانے، اُٹھنے بیٹھنے میں اُسے کیوں سلیقہ دکھائی نہیں دیتا.... اور میری یہ حالت ہے کہ ناک میں دم آچکا ہے اور مرد عورت کو مصیبت میں مبتلا کر کے آپ الگ ہو جاتے ہیں؟ یہ مرد .....!

میاّ نے کچھ باسمتی، دالیں اور نمک وغیرہ رسوئی میں بکھیر دیا اور پھر ایک بھیگی ہوئی ترازو میں اُسے تولنے لگی۔ ترازو گیلا تھا، یہ میاّ بھی دیکھ رہی تھی۔ اور جب باسمتی چاول پیندے میں چمٹ گئے تو بہو مرتی کرتی پھوہڑ ہو گئی اور آپ اتنی سگھڑ کہ نئے دوپٹے سے پیندا صاف کرنے لگی۔ جب بہت میلا ہو گیا تو دوپٹے کو سر سے اُتار کر ہولی کی طرف پھینک دیا اور بولی:-

"لے، دھو ڈال"

اب ہولی نہیں جانتی بچاری کہ وہ روٹیاں پکائے یا دوپٹہ دھوئے بولے یا نہ بولے، ہلے یا نہ ہلے۔ وہ کتیا ہے یا نیاب جادی۔ اس نے دوپٹہ دھونے ہی میں مصلحت سمجھی۔ اس وقت چاند گرہن کے زمرہ میں داخل ہونیوالا ہی ہوگا۔ بچہ دھلے ہوئے کپڑے کی طرح پچر مُرسا پیدا ہوگا اور اگر ماہ دو ماہ بعد بچے کا برا سا چہرہ دیکھ کر کسے کو سا جائے تو اس میں ہولی کا کیا قصور ہے؟...... لیکن قصور اور بے قصوری کی بات ہی علیحدہ ہے۔ کیونکہ یہ کوئی سننے کے لئے تیار نہیں کہ اس میں ہولی کا گناہ کیا ہے۔ سب گناہ ہولی کا ہے۔

اسی وقت ہولی کو سارنگ دیو گرام یاد آگیا۔ کس طرح وہ اسوج کے شروع میں دوسری عورتوں کے ساتھ گربا ناچا کرتی تھی، اور بھابی کے سر پر رکھے ہوئے گھڑے کے سوراخوں میں روشنی پھوٹ پھوٹ کر دالان کے چاروں کونوں کو منور کر دیا کرتی تھی۔ اس وقت سب عورتیں اپنے حنا مالیدہ ہاتھوں سے تالیاں بجایا کرتی تھیں اور گایا کرتی تھیں ——

ماہندی[1] تو اوی مالوے ÷ اینو رنگ گیو گجرات رے

ماہندی رنگ لاگیو رے

اس وقت وہ ایک اُچھلنے کودنے والی الھڑ چھوکری تھی، ایک بحرِ قافیہ سے آزاد نظم، جو چاہتی تھی پورا ہو جاتا تھا۔ گھر میں سب سے چھوٹی تھی ——

---

[1] ماہندی (حنا) تو مالوہ —— وسط ہند میں پیدا ہوئی تھی اس میں گجرات رنگا ہوا ہے (گویا) اسے حنا کا رنگ چڑھ گیا ہے۔

نہاب جادی تو نہ تھی اور اس کی سہیلیاں ———— وہ بھی اپنے اپنے قرض خواہوں کے پاس جا چکی ہوں گی۔

..... سارنگ دیو گرام میں گرہن کے موقع پر جی کھول کر دان کیا جاتا ہے۔ عورتیں اکٹھی ہو کر تروبیدی گھاٹ پر اشنان کے لئے جاتی ہیں۔ پھول، ناریل، بتاشے، سمندر میں بہاتی ہیں۔ پانی کی ایک اُچھال مُنہ کھولے ہوئے آتی ہے اور سب پھول پتوں کو قبول کر لیتی ہے۔ اس وقت کے اشنان سے سب مرد عورتوں کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ ان گناہوں کا جن کا ارتکاب لوگ گذشتہ سال کرتے رہے ہیں۔ اشنان سے سب پاپ دُھل جاتے ہیں۔ بدن اور روح پاک ہو جاتی ہے۔ سمندر کی لہر لوگوں کے سب گناہوں کو بہاکر دور، بہت دور ———— ایک نامعلوم، ناقابل عبور، ناقابل پیمائش سمندر میں لے جاتی ہے...... ایک سال بعد پھر لوگوں کے بدن گناہوں سے آلودہ ہو جاتے ہیں۔ پھر گہنا جاتے ہیں، پھر دریا کی ایک لہر آتی ہے اور پھر پاک و صاف۔

جب گرہن شروع ہوتا ہے اور چاند کی نورانی عصمت پر داغ لگ جاتا ہے تو چند لمحات کے لئے چاروں طرف خاموشی اور پھر رام نام کا جاپ شروع ہوتا ہے۔ پھر گھنٹے، ناقوس، سنکھ ایک دم بجنے لگتے ہیں۔ اس شور و غوغا میں اشنان کے بعد سب مرد عورتیں جھگھٹے کی صورت میں گاتے بجاتے گاؤں واپس لوٹتے ہیں۔

گرہن کے دوران میں غریب لوگ بازاروں اور گلی کوچوں میں دوڑتے

ہیں۔ لنگڑے بیساکھیاں گھماتے ہوئے اپنی اپنی جھولیاں اور کشکول تھامے پلیگ کے چوہوں کی طرح ایک دوسرے پر گرتے پڑتے بھاگتے چلے جاتے ہیں کیونکہ راہو اور کیتو نے خوبصورت چاند کو اپنی گرفت میں پوری طرح سے جکڑ لیا ہے۔ نرم دل ہندو دان دیتا ہے تاکہ غریب چاند کو چھوڑ دیا جائے اور دان لینے کے لئے بھاگنے والے بھکاری چھوڑ دو، چھوڑ دو، دان کا وقت ہے —— چھوڑ دو کا شور مچاتے ہوئے میلوں کی مسافت طے کر لیتے ہیں

چاند گرہن کے زمرہ میں آنے والا ہی تھا۔ ہولی نے بچوں کو بڑے کاستھ کے پاس چھوڑا۔ ایک میلی کچیلی دھوتی باندھی اور عورتوں کے ساتھ ہر پھول بندر کی طرف اشنان کے لئے چلی۔

اب میّا، رسیلا، بڑا لڑکا شبّو اور ہولی سب سمندر کی طرف جا رہے تھے۔ گجرے تھے اور آم کے پتّے تھے اور بڑی اماں کے ہاتھ میں رودرکش کی مالا کے علاوہ مشک کافور تھا جسے وہ جلا کر پانی کی لہروں پر بہا دینا چاہتی تھی تاکہ مرنے کے بعد سفر میں اس کا راستہ روشن ہو جائے اور ہولی ڈرتی تھی —— کیا اس کے گناہ سمندر کے پانی سے دُھل جائیں گے؟

سمندر کے کنارے، گھاٹ سے پون میل کے قریب ایک لانچ کھڑا تھا۔ وہ جگہ ہر پھول بندر کا ایک حصّہ تھی۔ بندر کے چھوٹے سے ناہموار ساحل اور ایک مختصر سے ڈاک پر کچھ ٹینڈل غروب آفتاب میں روشنی اور اندھیرے کی کشمکش کے غلاف ننھے ننھے بے بضاعت سے خاکے بنا رہے تھے اور لانچ کے کسی کیبن سے ایک ہلکی سی ٹمٹماتی ہوئی روشنی سیماب دار پانی کی لہروں پر ناچ

ناچ رہی تھی۔ اس کے بعد ایک چرخی سی گھومتی ہوئی دکھائی دی۔ چند ایک دھندلے سے سائے ایک اژدہا نما رسّے کو کھینچنے لگے۔ آٹھ بجے اسٹیمر لانچ کی آخری سیٹی تھی ـــــ پھر وہ سارنگ دیوگرام کی طرف روانہ ہوگا۔ اگر ہولی اس پر سوار ہو جائے تو پھر ڈیڑھ دو گھنٹے میں وہ چاندنی میں نہاتے ہوئے گویا صدیوں سے آشنا کلس دکھائی دینے لگیں...... اور پھر وہی اماں ..... کنوارپن اور گربا ناچ!

ہولی نے ایک نظر سے شبو کی طرف دیکھا۔ شبو حیران تھا کہ اس کی ماں نے اتنی بھیڑ میں جھک کر اس کا منہ کیوں چوما اور ایک گرم گرم قطرہ کہاں سے اسکے گالوں پر آپڑا۔ اس نے آگے بڑھ کر رسیلے کی انگلی پکڑلی۔ اب گھاٹ آچکا تھا۔ جہاں سے مرد اور عورتیں علحدہ ہوتی تھیں۔ ہمیشہ کے لئے نہیں، فقط چند گھنٹوں کے لئے..... اسی پانی کی گواہی میں وہ اپنے مردوں سے باندھ دی گئی تھیں۔ پانی میں بھی کیا پُر اسرار، بعید الفہم طاقت ہے ـــــ اور دور سے لانچ کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی ہولی تک پہنچ رہی تھی۔

ہولی نے بھاگنا چاہا مگر وہ بھاگ بھی تو نہ سکتی تھی۔ اس نے اپنی ہلکی سی دھوتی کو کس کر باندھا ـــــ دھوتی نیچے کی طرف ڈھلک جاتی تھی.... آدھ گھنٹے میں وہ لانچ کے سامنے کھڑی تھی۔ لانچ کے سامنے نہیں ـــــ سارنگ دیوگرام کے سامنے...... وہ کلس، مندر کے گھنٹے، لانچ کی سیٹی، اور ہولی کو یاد آیا کہ اسکے پاس تو ٹکٹ کے لئے بھی پیسے نہیں ہیں۔

وہ کچھ عرصہ تک لانچ کے ایک کونے میں بدحواس ہو کر بیٹھی رہی۔ پوتے اٹھ

بجے کے قریب ایک ٹینڈل آیا اور ہولی سے ٹکٹ مانگنے لگا۔ ٹکٹ نہ پانے پر وہ خاموشی سے وہاں سے ٹل گیا۔ کچھ دیر بعد ملازموں کی سرگوشیاں سنائی دینے لگیں...... پھر اندھیرے میں خفیف سے ہنسنے اور باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کوئی کوئی لفظ ہولی کے کان میں بھی پڑ جاتا ـــــ مرغی...... دولے

...... چابیاں میرے پاس ہیں...... پانی زیادہ ہوگا......

اس کے بعد چند وحشیانہ قہقہے بلند ہوئے اور کچھ دیر بعد تین چار آدمی ہولی کو لانچ کے ایک تاریک کونے کی طرف دھکیلنے لگے۔ اسی وقت آبکاری کا ایک سپاہی لانچ میں وارد ہوا ہیں جبکہ دنیا ہولی کی آنکھوں میں تاریک ہو رہی تھی ہولی کو اُمید کی ایک شعاع دکھائی دی۔ وہ سپاہی سارنگ دیو گرام کا ہی ایک چھوکرا تھا اور میکے کے رشتے سے بھائی تھا۔ چھ سال ہوئے وہ بڑی اُمنگوں کے ساتھ گاؤں سے باہر نکلا تھا اور سابرمتی پھاند کر کسی نامعلوم دیس کو چلا گیا تھا کبھی کبھی مصیبت کے وقت انسان کے حواس بجا ہو جاتے ہیں۔ ہولی نے سپاہی کو آواز سے ہی پہچان لیا اور کچھ دلیری سے بولی:۔

"کنھو رام"

کنھو رام نے بھی سیتن کی چھوکری کی آواز پہچان لی۔ بچپن میں وہ اس کے ساتھ کھیلا تھا ـــــ

کنھو رام بولا:۔

"ہولے!"

ہولی یقین سے معمور مگر بھرائی ہوئی آواز میں بولی "کنھو بھیا...... مجھے

سارنگ دیو گرام پہنچا دو.....،،

کتھورام قریب آیا اور ایک ٹینڈل کو گھورتے ہوئے بولا:۔

"سارنگ دیو جاؤ گی ہولے،، اور پھر سامنے کھڑے ہوئے آدمی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا" تم نے اسے یہاں کیوں رکھا ہے بھائی؟"

ٹینڈل جو سب سے قریب تھا بولا:۔

"بچاری کوئی دکھیا ہے۔ اس کے پاس تو ٹکٹ کے پیسے بھی نہیں تھے۔ ہم سوچ رہے تھے ہم اس کی کیا مدد کر سکتے ہیں؟"

"کتھورام نے ہولی کو ساتھ لیا اور لانچ سے نیچے اتر آیا۔ ڈاک پر قدم رکھتے ہوئے بولا

"ہولے..... کیا تم اساڑھی سے بھاگ آئی ہو؟"

"ہاں!"

"یہ سر پیچ جادیوں کا کام ہے؟......... اور جو میں کائستھوں کو خبر کر دوں تو؟"

ہولی ڈر سے کانپنے لگی۔ وہ نہ تو نباب جادی تھی اور نہ سر پیچ جادی۔ اس جگہ اور ایسی حالت میں وہ کتھورام کو کچھ کہہ بھی تو نہ سکتی تھی۔ وہ اپنی کمزوری کو محسوس کرتی ہوئی خاموشی سے سمندر کی لہروں کے تلاطم کی آوازیں سننے لگی۔ پھر اس کے سامنے لانچ کی رسّے ڈھیلے کئے گئے۔ ایک ہلکی سی وسل ہوئی اور ہولے ہولے سارنگ دیو گرام ہولی کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس نے ایک دفعہ پیچھے کی جانب دیکھا۔ لانچ کی ہلکی سی روشنی میں اسے جھاگ کی ایک لمبی سی

لکیر لانچ کا پیچھا کرتی ہوئی دکھائی دی۔

کنتھورام بولا "ڈرو نہیں ہولے...... میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گا۔ یہاں سے کچھ دور ناؤ پڑتی ہے۔ پو پھٹے لے چلوں گا۔ یوں گھبراؤ نہیں، رات کی رات سرائے میں آرام کر لو۔"

کنتھورام ہولی کو سرائے میں لے گیا۔ سرائے کا مالک بڑی حیرت سے کنتھورام اور اس کی ساتھی کو دیکھتا رہا۔ آخر جب وہ نہ رہ سکا تو اس نے کنتھورام سے نہایت آہستہ آواز میں پوچھا "یہ کون ہیں؟"

کنتھورام نے آہستہ سے جواب دیا "میری پتنی ہے"

ہولی کی آنکھیں پتھرانے لگیں۔ ایک دفعہ اس نے اپنے پیٹ کو سہارا دیا اور دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گئی۔ کنتھورام نے سرائے میں ایک کمرہ کرائے پر لیا۔ ہولی نے ڈرتے ڈرتے اس کمرے میں قدم رکھا۔ کچھ دیر بعد کنتھورام آیا تو اس کے منہ سے شراب کی بو آرہی تھی......

سمندر کی ایک بڑی بھاری اچھال آئی۔ سب پھول، بتاشے، آم کی ٹہنیاں گجرے اور جلتا ہوا مشک کا فور بہا کر لے گئی۔ اس کے ساتھ ہی انسان کے مہیب ترین گناہ بھی لیتی گئی —— دور، بہت دور، ایک نامعلوم، ناقابلِ عبور، ناقابلِ پیمائش سمندر کی طرف........ جہاں تاریکی ہی تاریکی تھی .... پھر سنکھ بجنے لگے۔ اس وقت سرائے سے کوئی عورت نکل کر بھاگی۔ سرپٹ۔ بگٹٹ۔ ...... وہ گرتی تھی، بھاگتی تھی، پیٹ پکڑ کر بیٹھ جاتی، ہانپتی اور دوڑنے لگتی۔

..... اس وقت آسمان پر چاند پورا گہنا چکا تھا۔ ہو اور کیتو نے جی بھر کر قرضہ وصول کیا تھا....... دو دھندلے سے سائے اس عورت کی مدد کے لئے سراسیمہ اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے...... چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا اور دور اسا ڑھی سے ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں ——

دان کا وقت ہے.....

چھوڑ دو..... چھوڑ دو..... چھوڑ دو.......

ہر پھول بندر سے آواز آئی ——

پکڑ لو...... پکڑ لو..... پکڑ لو.....

....

چھوڑ دو.... دان کا وقت ہے..... پکڑ لو..... چھوڑ دو!!

جُونیئر

وہ جُونیئر وکیل تھا اور جُونیئر کے معنی ہیں نچلی سیڑھی پر ہونیکے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے ترقی کی سیڑھی پکڑے لٹکا ہوا تھا۔ نظریں اُوپر اٹھی ہوئیں، ہاتھ کانپتے ہوئے اور پاؤں ڈگمگاتے ہوئے سیڑھی کے بالائی ڈنڈوں پر چڑھے ہوئے سینیروں کی خاکِ پا کو چار و ناچار سرمۂ چشم بنا رہا تھا اور بہت سے تازہ واردانِ بساط ہولائے دل سیڑھی کے اِرد گرد کھڑے اس کی ٹانگیں کھینچنے کے درپے تھے، مگر وہ سیڑھی سے چمٹا ہی رہا۔ کیا کرتا۔ سب سیڑھیوں کا یہی حال تھا۔ لیکن باوجود سخت کوشش اور ناصیہ فرسائی کے وہ کسی سینیر سے اپنے آپ کو چپکا نہیں سکا۔ ممکن تھا کہ وہ اس طرح سینیر کی ٹانگوں سے وابستہ ہو کر اوپر کھنچا چلا جاتا۔ فی الحال تو اسے تن تنہا ہاتھ پاؤں مارنا تھا۔ ایسا نہ ہو وہ دھب سے نیچے گر کر بھیڑ میں کچلا جائے۔ اس کے اِرد گرد، پہلو بہ پہلو اور بہت سے جونیر تھے جو اسی طرح لٹکے ہوئے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ اور چند سینیروں کی ٹانگوں سے لگے ہوئے آہستہ آہستہ اوپر بھی چڑھے جا رہے تھے۔

وہ ایک بوڑھے پیروی کار کا بیٹا اور ایک کھوسٹ جاں بلب پنشن یافتہ پیشکار کا پوتا تھا۔ کچہری کے دشت کی سیاحی میں اس کی دو پشتیں گزر چکی تھیں اور پیشۂ آبا کی روایات کو زیادہ چمکاتے ہوئے وہ وکیل بن گیا تھا۔ بوڑھے پیروی کار نے کچہری، اجلاس اور وکالت خانہ کی آغوش میں انگشت خواب دیکھے تھے۔ اس کی تمناؤں نے فائلوں، مسلوں اور زرخیز مقدموں کی دنیا میں پرورش پائی تھی۔ لہذا اس نے اپنی جوانی کے پہلے ثمر کو اعلیٰ تعلیم دلوا کر وکیل بنانے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ پیروی کار نہایت ہی جز رس اور کفایت شعار انسان تھا۔ اس نے اپنی کمائی کی کوڑی کوڑی جمع کی اور محض اس اعلیٰ مقصد کے لئے کہ وہ اپنے نونہال کو کالجوں کی تعلیم کے بعد اجلاسوں پر کبھی پھول برساتا اور کبھی شعلہ فشانی کرتا ہوا دیکھے اور پھر زمینداروں کی گرم بازاری! پیشکار صاحب کی دولت کے برتے پر وہ خود پڑھائی سے سبکدوش ہی رہا تھا۔ لیکن ان کی دولت بٹ بٹا کر اسے بس اتنی ملی کہ وہ زمینداروں کے مقدموں کی پیروی کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس لئے کہ گھر کا آٹا گیلا نہ ہو۔ جیسے جیسے وہ راہ و رسمِ منزل سے باخبر ہوتا گیا۔ اس کے بٹوے کا منہ بند ہونے لگا۔ مگر اپنے مقصد کے حصول کے ذریعوں پر اس نے کافی خرچ کیا۔ بیٹے کی تعلیم کا بوجھ وہ خوشی سے برداشت کرتا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کو ہوسٹل میں رکھ کر آسائش کے ساتھ تعلیم دلوائی۔ ہاں فضول خرچی کے خلاف وہ چھٹیوں میں اکثر

وعظ بھی کر دیا کرتا تھا۔ اور خرچ کے حساب پر کڑی نگرانی رکھتا تھا۔

آخر کار بیٹا وکیل بن ہی گیا۔ بڑی مشکل سے اس کی شادی بی۔ اے پاس کرنے تک رُکی رہی ورنہ نسبتیں تو پکے ہوئے بیروں کی طرح ٹپکی پڑتی تھیں۔ بی۔ اے پاس ہونے کے بعد ہی لڑکوں کے بازار بھاؤ میں اضافہ ہو جاتا ہے کئی لڑکیوں کے باپ تو قانون کی تعلیم کا خرچ بھی برداشت کرنے کو برضا تیار تھے۔ لیکن پیروی کار تکمیل تمنّا کی راہ میں کسی کی دستگیری گوارا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے سپوت کو اپنے زور بازو سے وکیل بنانے کا آرزو مند تھا۔ سارے جسم کی سوئیاں اس نے خود نکالی تھیں تو آنکھوں کی سوئیاں کسی دوسرے کو وہ کیوں نکالنے دیتا۔ جب اس کے بیٹے نے وکالت کا امتحان پاس کر لیا تو ایک پنشن یافتہ ڈپٹی صاحب کے گھر اس کی شادی کی گئی۔ پیروی کار کو اونچے گھرانوں سے تعلق پیدا کر کے اپنے نام و نمود میں اضافہ کرنے کا خیال بھی تھا۔ لڑکے کو سسرال سے توقع سے کم روپے ملے۔ مگر اثاثہ کافی ملا۔ نئی وضع کا سنگاردان جس میں جدید تراش کے حلبی آئینے جڑے ہوئے تھے۔ شاندار مسہری، میز کرسیاں اور ڈرائنگ روم کا اچھا سا سیٹ، برتن باسن بھی خاصی تعداد میں اور سب سلیقے کے، ریڈیو کا خیال تھا، مگر اس سے بہتر سنگر مشین سمجھی گئی۔ غرض بڑی اچھی شادی ہوئی۔ باپ، بیٹا، عزیز، رشتہ دار سب خوش تھے۔

پیروی کار نے سمدھیانے کے روپوں کو جمع کرا دیا مگر جلد ہی قانون کی گراں قیمت کتابوں اور نظیروں کی خرید کے لئے ان کی ضرورت پڑی۔

بڑے حوصلے سے وکالت شروع کی گئی تھی۔

ہر چند کہ کسی سینیر کے ماتحت رہ کر کام کرنے کا فخر نوخیز وکیل کو حاصل نہ ہو سکا، پنشن یافتہ ڈپٹی صاحب نے بھی داماد کی خاطر اپنے گذشتہ اثر ورسوخ کو بر سرِ کار لانے کی کوشش کی، مگر کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ ہر سینیر صاف انکار تو کرتا نہیں تھا۔ مگر دابستہ داماں جونیروں کی بھیڑ بھاڑ جتلا کر عذر کر دیا کرتا تھا۔ تاہم نوخیز وکیل نے بڑی امیدوں کے ساتھ تن وتنہا اپنے پیشے کی ابتدا کر دی۔ ہاں خرانٹ وکیلوں کے درِ دولت پر سلام کرنے وہ اکثر حاضر ہو جایا کرتا تھا۔ ایک کاروان تائید کی خدمتیں بھی حاصل کر لی گئیں۔ اور اس کے بعد باپ بیٹا دونوں ہوائی محلوں کی تعمیر میں مشغول ہو گئے۔

نوخیز وکیل اپنے آفس میں گھومنے والی کرسی پر بیٹھتا۔ سامنے سکریٹریٹ ٹیبل پر خوبصورت چمکتی ہوئی شیشے کی دستی۔ سلور کا صاف سا کیلنڈر، نفیس و رنگین پیپر ویٹ، سادے کاغذوں سے بھری ہوئی خلیٹ فائلیں وقلمیں پر بے داغ جاذب، سلیقے سے رکھے ہوئے دو فاؤنٹن پن اور آبنوسی بک کیس میں موٹی موٹی قانونی کتابوں کے ہم پہلو رسکن، کارلائل، میکالے اور برک کے شاہکار ہوئے۔ کرسی پر پہلو بدلتے بدلتے وکیل اپنے پاؤں میز پر رکھ کر پھیل جاتا۔ میز گھڑی ٹک ٹک ٹک ٹک کرتی رہتی۔ شاندار الماریوں میں سنہرے حروف سے مزین رعب ڈالنے والی کتابیں فوجی باقاعدگی کے ساتھ ترتیب والے لائینوں

میں آلا راستہ نظر آتیں۔ جیسے کوئی فوجی دستہ چمکتے ہوئے لباس اور اسلحوں کے ساتھ "اٹنشن" کی حالت میں ہو۔ اس کے دماغ میں خیالات مارچ کرتے ہوئے آتے بلکہ یوں کہئے کہ وہ خود خیالات و تصوّرات کی پلٹنوں کو منظّم کرتا، انھیں ساری دنیا کی فتح کے لئے روانہ کر دیتا۔ اور فاتح جرنیل کی طرح فتوحات کے نشہ سے سرشار ہو جاتا ہے۔ اس کا کمرہ عموماً خالی ہی رہتا تھا۔ خیالات میں کوئی شے حائل نہیں ہوتی، یہ تصوّرات کبھی اس درجہ حقیقی بن جاتے کہ نوجوان وکیل خیال ہی خیال میں بحث و تقریر کرتے ہوئے واقعی بلند آواز میں سرگرم ہو جاتا۔ "می لورڈ! بات یوں ہے کہ حقیقت کو چھپایا نہیں جا سکتا۔ صداقت چمکتے ہوئے سورج کی طرح روشن ہے۔ ظلم کی سیاہی لفّاظی سے نہیں دھوئی جا سکتی۔ مرڈر مسٹ اسپیک!، شکسپیر کا یہی خیال تھا۔ کون شکسپیر؟ وہ جو فطرت انسانی کا رازداں تھا۔ خونِ ناحق چھپائے چھپ نہیں سکتا ہے۔ ایک شاعر نے کہا ہے اور می لورڈ! شاعر نبّاضِ حیات ہوتا ہے۔ ؏

جو چُپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا"

"جی حضور کیا حکم ہے؟" تائید نے کمرے میں آکر گھبرا کے پوچھا۔

"می لورڈ! میں آج ثابت کر دوں گا کہ میرے موکل کے بیٹے کا ناحق خون کیا گیا۔ سچائی خود ایک زبردست شہادت ہے!" وکیل نے میز پر مُکّا مارا۔

"حضور کا مزاج کیسا ہے؟" تائید نے چیخ کر کہا۔

نوجوان وکیل چونک اٹھا اور صورت حال کو سمجھ کر شرمندہ ہوا۔
"کچھ نہیں! یونہی ایک کتاب کی عبارت کو زور زور سے پڑھ رہا تھا۔
ایسے واقعات تائید کے علاوہ کئی بار خدمتگاروں کے ساتھ بھی پیش آئے۔ غرض گھر پر اسی طرح گذر رہی۔ دس بجے دن کو کچہری جانا ہوتا۔ اس کا اہتمام نو بجے سے ہی شروع ہو جاتا۔ جونیر وکیل گھر ہی سے سیاہ عبا پہن کر روانہ ہوتا۔ اسے پہنتے وقت وہ ایسا محسوس کرتا کہ یہ کوئی جادو کا چغہ ہے۔ جسے پہنتے ہی وہ ترقی کی فضاؤں پر لگا کر اڑنے لگے گا۔
وکالت خانہ پہنچتے ہی اس کے پر سمٹ جاتے۔ تصوّرات کا بیلون پچک جاتا اور وہ کھچم کھچ بھرے ہوئے کمرے میں محض ایک جونیر وکیل نظر آتا۔ ہر میز پر بھانت بھانت کے وکیلوں کے پرے سے پرے ہوتے ہیں۔ کچہری کا شور و ہنگامہ اور کرسی میز سبھی رعب ڈالنے والی چیزیں تھیں۔
وہ اس سمندر میں ایک قطرۂ ناچیز تھا۔ حجاب کے پسینے میں اس کی انفرادیت ڈوب جاتی۔ وہ کسی گوشے میں ایک کرسی پر اپنی جگہ بنا لیتا۔ رفتہ رفتہ لوگوں کی جائزہ لینے والی نظریں اس سے ہٹ جاتیں۔ اور وہ اطمینان کی سانس لیتا۔ تھوڑی دیر کے بعد لوگوں کو اس کی ہستی کا احساس تک باقی نہیں رہتا۔ اس سے اسے ایک گونہ تکلیف پہنچتی۔ وہ خیالات میں غرق ہو جاتا۔ اس مایوسی کی ٹھوکر سے اس کی شخصیت پھر ابھرنے لگتی۔ وہ سوچتا۔ وہ دن بھی آنے والا ہے جب سارے وکلاء کمرے میں میرے داخل ہوتے ہی بچھے پڑیں گے۔ ہر جگہ

میرا طوطی بولے گا۔ ہر اجلاس پر میری دھوم مچ جائے گی۔ وہ اسی طرح سوچتا جاتا۔ تاآنکہ شام ہو جاتی اور وہ اپنے تائید کے ہمراہ گھر لوٹ جاتا۔

رات کو وہ اپنے آفس میں بیٹھا قانون کی کتابیں الٹ پلٹ کر دیکھتا۔ اور زرّیں مستقبل کے خواب۔

پیردی کار اپنے بیٹے کا ذکر اب اس کا نام لے کر نہیں کرتا بلکہ ہر موقع پر "وکیل صاحب" کہہ کر اسے یاد کرتا۔ وہ اکثر وکیل صاحب کا تذکرہ کرتا رہتا۔ عزیزوں سے، دوستوں سے، اِن سے اُن سے، سب سے اس طرح اس کے پندار کو تسکین ہوتی، وہ خواہ مخواہ بے بات کی بات میں بھی اپنے بیٹے کے ذکر کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور نکال لیتا۔ مقدموں کی بات ہو تو خیر۔ بے جوڑ گفتگو کے موقع پر بھی "وکیل صاحب" تشریف لے آتے تھے۔ ریلوے ٹائم ٹیبل کے بارے میں بھی اگر بول چال ہو تو "وکیل صاحب" درمیان کلام میں یوں نکل آتے کہ "ٹائم ٹیبل — ہاں ٹائم ٹیبل" وکیل صاحب جب کالج میں پڑھتے تھے تو انھیں ٹائم ٹیبل کا زیادہ حصّہ زبانی یاد ہوتا تھا۔ شروع ہی سے یہ ذہین اور ہوشیار ہیں"۔ یا یوں ——— "بھائی سفر میں آرام کہاں! ہاں سکنڈ فرسٹ کلاس میں تھوڑا بہت آرام مل جاتا ہے۔ اسی وجہ سے وکیل صاحب جب سفر کرتے ہیں سکنڈ کلاس ہی میں کرتے ہیں"۔ ——— پیردی کار نے معقول طریقوں سے بھی اپنے بیٹے کا پروپیگنڈا کرایا۔ کچہری کے دلالوں سے اس کی پرانی ملاقات تھی۔ وہ وکالت کے پیشے کے سارے ہتھکنڈے

جانتا تھا۔ اس نے خوب تنگ دو دو کی اور آئندہ ترقی کی آس لگائے صبر سے انتظار بھی کرتا رہا۔ مگر وکیلوں کی تعداد ہی اتنی زیادہ ہو چکی تھی کہ حق ناحق کے مقدمے کہاں سے اتنے آئیں کہ سب کی وکالت چمکے۔ انتظار کی مدت بہت طویل ہوتی جا رہی تھی۔ تاہم باپ بیٹے دونوں بڑی بڑی امیدوں کے چراغ جلا رہے تھے۔

اب کچھ موکل جونیر وکیل کو ملنے لگے۔ وہ دن اس کے لئے عید کا دن تھا جب پہلی بار دلال کی کوششوں سے اسے ایک چھوٹا موٹا کام ملا۔ تاریخ بڑھانے کی درخواست پیش کرنے کو اسے اجلاس پر حاضر ہونا تھا۔ جونیر جوشِ مسرت میں گھبراہٹ اور حجاب کے اثرات سے بھی محفوظ رہا۔ اس پر ولولہ اور اُمنگ کا جذبہ طاری تھا۔ آج وہ اپنے کو صحیح معنوں میں وکیل محسوس کر رہا تھا۔ وہ پہلی جست میں گویا مینارِ ترقی پر چڑھ گیا تھا۔ دنیا اور اس کے بسنے والے اسے حقیر نظر آ رہے۔ حاکم کرسی پر بیٹھا ہوا اسے ایک ادنیٰ خادم معلوم ہو رہا تھا۔ جس کا بس اتنا کام ہے کہ اس کے حکم کی تعمیل کرے۔ اجلاس سے باہر آکر اسے فیس کے دو روپے ملے۔ وہ پھولا نہیں سما رہا تھا۔ دو روپیوں کی حقیقت کیا تھی۔ وہ اس نادر تجربے کی سرمستیوں میں غرق تھا۔ نہایت ہی لاپروائی سے اس نے دونوں روپے جیب میں ڈال لئے۔

"حضور! میری خدمت کا معاوضہ؟" دلال نے کہا۔

وکیل نے جیب سے ایک روپیہ نکال کر دلال کے بڑھے ہوئے ہاتھ

پر رکھ دیا اور مسکراتا ہوا وکالت خانہ کی طرف چلا گیا۔ وہاں وہ ایک فاتح کی طرح داخل ہوا اور سارے وکیلوں کو نظر انداز کرتا ہوا ایک محفوظ گوشے میں جا کر بیٹھ رہا۔ بیٹھے بیٹھے اس نے بہت سے دیکھے ہوئے خواب پھر دیکھے اور کچھ نئے خواب بھی۔ اس نے اپنی سرشار شباب بیوی کو دیکھا۔ اس کے پازیب کی جھنکار سنی۔ اس کی مسکراہٹوں کو شفق رنگین کی طرح پھولتے ہوئے دیکھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کی بیوی اس پر فخر کر رہی ہے اور اس کے جوشِ ستائش کی شدّت کا اظہار ایک والہانہ سپردگی کی کیفیت سے ہو رہا ہے۔ نوجوان وکیل بہت دیر تک جاگتے ہوئے سپنوں کے رنگ برنگ جالے بنتا رہا۔ تائید کی آواز نے اس کے سپنوں کے پرندوں کو خیال و تصوّر کے رنگین جزیروں کی طرف اڑ جانے پر مجبور کر دیا اور وہ جوشِ انبساط میں ڈوبا ہوا گھر لوٹا۔

بوڑھا بیرد ی کا رکھی باغ باغ ہو رہا تھا۔ اس کا بیٹا ترقی کی پہلی سیڑھی پر چڑھ گیا تھا۔ اس کے خواب حقیقت بننے والے ہی تھے۔ اس خوشی میں اس نے بیٹے کی تحریک پر بہو کو اس کے میکے سے اپنے گھر بلوایا۔ نوجوان وکیل کے دل میں بہار آ گئی۔ اسے زندگی کا ہر لمحہ بامعنی معلوم ہوتا تھا۔ اب اس کا پیشہ اس کے لئے نئے نئے ممکنات اور نئی مسرّتوں کا حامل تھا۔ اپنی چھوٹی سی زندگی خود بنانی۔ اپنی دنیا کو آپ سجانا، کسی پیاری ہستی کے لئے جہدِ حیات میں مشغول

ہو جانا پُر قوت بازو اور ارمان سے بھرا ہوا دل رکھنے والے ایک نوجوان کے لئے حاصل حیات ہے۔ جونیر وکیل مستقبل پر نظر جمائے آہستہ خرام حال میں متوقعہ کامرانی کا انتظار کر رہا تھا۔ ہجوم انبساط میں وہ تھوڑی سی بیزاری محسوس کرتا تھا۔ اپنی ناز پروردہ بیوی کے لئے وہ بہت کچھ کرنا چاہتا تھا مگر کام اُسے اکّا دکّا ہی ملتا تھا اور جو فیس بھی اسے ملتی وہ پیروی کار کے اس مشورے کی نذر ہو جاتی۔ "بیٹا ہائی کورٹ میں نام درج کرانے کی فیس کے لئے روُپے جمع کرو"

اس کی بیوی۔ کے نجی خرچ کے لئے اس کے میکے سے روپے آجاتے تھے۔ وہ ابھی غیر رومانی مسئلوں کے سلسلے میں اپنے شوہر سے کھلی ملی نہ تھی۔ مگر نوجوان وکیل جب سنگار دان پر "عمر خیام" "آئی سلما کریم" "ہزلن اسنو" "کیلی فورنین پاپی" وغیرہ آراستہ دیکھتا تو اس کے دل پر ایک ہلکی سی موہوم چوٹ لگتی۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ سب چیزیں اس کی دی ہوئی ہوتیں۔ اسے وہم ہونے لگتا کہ اس کی بیوی کی حسین نگاہوں میں اس کے شکست پندار کے لئے کچھ ضربیں چھپی ہوئی ہیں۔ اس کے بہت سے عشرت بہ آغوش لمحات میں اسی نوع کے احساسات نے تلخی کی آمیزش کی تھی۔

اس کا نام ہائی کورٹ میں بھی درج ہو گیا لیکن اب تک کام کا یہی عالم تھا۔ زیادہ تر ایسے لوگ جونیر وکیل کی طرف رجوع کرتے جو کچہری کے چھوٹے چھوٹے کاموں پر کچھ بھی رقم خرچ کرنی نہیں چاہتے تھے

کوئی تھوڑا سا بھی جانا پہچانا موکل یوں تمہید شروع کرتا......

"آپ کے سسر اور میرے چچا سے دانت کاٹی دوستی تھی۔ ہم نوالہ اور ہم پیالہ۔ کیا وہ زمانہ تھا! اب ایسے لوگ کہاں جو دوستی کا خیال رکھتے ہوں! مگر جناب ڈپٹی صاحب بڑے وضع دار آدمی ہیں۔"

"آپ کے نانا صاحب اور میرے دادا اپنے ممیرے پھوپھیرے بھائی تھے" کوئی شجرۂ نسب سے ابتدا کرتا اور سب کی انتہا یہ ہوتی کہ "آپ مجھ سے فیس کیا لیجئے گا" اور وہ کچی ما فی الضمیر جونیئر وکیل کچھ تو شہرت حاصل کرنے کے لئے اور کچھ مروّت سے مفت میں کام کر دیتا اور یاران ہوشیار اس انداز سے رخصت ہوتے کہ انھوں نے ہی وکیل سے کام لے کر اس کی عزّت افزائی کی ہے۔

زمانہ اسی طرح گزرتا رہا کہ مہینے میں دس پندرہ روپوں سے زیادہ جونیئر وکیل کو نہیں ملے اور وہ بھی اس بُرے حال سے کہ کوئی مقدمہ باز کسی دلاّل کی سفارش سے اس پر عنایت کر دیتا۔ وکالت خانے میں وہ روزانہ اپنی دکان لگاتا مگر کوئی خریدار قسمتوں سے ہی اس طرف بھٹک کر آنکلتا۔ جیسے کوئی طیّارہ دھم سے زمین پر آرہے۔ اسی طرح نوجوان وکیل کی آرزوئیں پرشکستہ ہو کر تلخ حقیقتوں کے دلدل میں آگری تھیں۔ بوڑھا پیر دی کار اس ناکامیابی کا ذمہ دار اپنے بیٹے کو سمجھنے لگا اور رفتہ رفتہ اس کے خیال میں بیٹے کی نا اہلیت مسلّم ہو گئی۔ بوڑھے پیر دی کار کے لئے یہ بہت بڑا صدمہ تھا۔

بعض دفعہ ردّ عمل بھی عجیب طرح ہوتا ہے۔ وہ مقصدِ حیات میں ناکامیاب ہو کر اس ہستی سے ہی برگشتہ ہو گیا۔ جس سے وہ مقصد وابستہ تھا۔ پیر دی کار کی منطق بہت سادہ تھی۔ زندگی میں وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو اس کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اور ناکامیابی ان کا حصّہ ہے جو نااہل ہیں۔ کامیابی کے فارمولا پر اس کا بیٹا پورا نہ اترا۔ اور اس کے ارمان و تمنّا کے خواب کاتک کے بن برسے ہوئے بادل کے ٹکڑوں کی طرح تتر بتر ہو گئے۔ پیر دی کار بیٹے سے برگشتہ ہو گیا۔ اور اسی تناسب سے اس کے بڑھاپے کی باچھیں تنگ ہوتی گئیں۔ رفتہ رفتہ پیر دی کار انتہا سخت گیر اور کوتاہ دست ہو گیا۔ ویسے بھی وہ کم مایہ آدمی تھا اور اب اس نے اپنی تھوڑی بہت پونجی سختی کے ساتھ بچانی چاہی۔ پھر سب پر طرہ اس کا چڑچڑاپن۔ نوجوان مگر ناکامیاب وکیل حوصلہ شکن بیزاری کے عالم میں زندگی بسر کر رہا تھا۔

جونیر وکیل نے اپنی جدوجہد میں اضافہ کر دیا۔ تاہم نتیجہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ وہ محض ایک جونیر وکیل تھا اور جونیر کے معنی ہیں نچلی سیڑھی پر ہونے کے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے ترقی کی سیڑھی پکڑے لٹکا ہوا تھا۔ نظریں اوپر اٹھی ہوئیں۔ ہاتھ کانپتے اور پاؤں ڈگمگاتے ہوئے۔ بے یار و مددگار۔ پیشہ ورانہ رقابتوں کا شکار۔ مگر وہ سیڑھی سے چمٹا ہی رہا۔ کیا کرتا۔ سب سیڑھیوں کا یہی حال تھا۔

وہ ابھی ناکامیابی کی اس منزل پر نہیں پہنچا تھا جہاں بے حسی میں تجارت

ملتی ہے۔ اس کا زخم ہنوز ناسور نہیں ہوا تھا۔ اس کا احساس سب سے زیادہ اپنی بیوی کے سامنے بیدار ہوتا۔ اسے بیوی سے جھجک محسوس ہوتی تھی۔ ہر چند کہ اس کی راتیں اپنی شریکِ حیات کی معیت ہی میں گزرتیں لیکن وہ ایسا کھویا کھویا سا رہتا جیسے وہ قریب ہوتے ہوئے بھی بہت دور ہے۔ اس کے لئے بیوی اس کی ناکامیابی کا آئینہ تھی۔ اس کی ناکامیابی سے بے خبر۔ اس کے پاس جب بھی وہ ہوتا وہ محسوس کرتا کہ کوئی کہہ رہا ہے۔ "تم نے ناحق شادی کی۔ تم بھی کیا مرد ہو! نکھٹو! بیکار!" اور غریب بیوی، مایوس، مضمحل، دل شکستہ تھی۔ اب اس کی سنگار دان ویران تھا۔ اس کا آئینہ اداس، اس کی مسہری بے کیف۔

ایک دن جوان وکیل اپنے ویران آفس کی تنہائی سے گھبرا اٹھا کچہری جانے سے پہلے زنان خانے میں جا نکلا اور چہرے پر نقلی شگفتگی کا غازہ مل کر بیوی کے پاس گیا۔ بیوی بیٹھی ہوئی چادر کو مشین پر سی رہی تھی۔

"کیسے اس وقت ادھر آ نکلے؟" بیوی نے فوراً کام بند کرتے ہوئے مسرت سے دریافت کیا۔ اس کے لہجے میں ایک دردمندانہ طنز بھی تھا۔

"میں دیکھنے آیا تھا تم کیا کر رہی ہو۔ بس یونہی!" وہ نہیں جانتا تھا کہ کیا جواب دے رہا ہے۔

"آپ تو ہر وقت مشغول رہتے ہیں۔ جب گھر آتے بھی ہیں تو کھوئے

ہوئے ہے۔ ہر وقت مقدموں کی ہی فکر۔ دلیلیں سوچتے رہتے ہوں گے۔
ایسی بھی کیا کام کی دھن!" بیوی نے شوہر کو غیر معمولی طور پر خوش دیکھ کر
محبت سے گلہ کیا۔ وہ کیا جانتی تھی کہ یہ خوشی محض ایک عارضی پناہ ہے۔

"ہاں ٹھیک مقدموں کی فکر، مقدمے کچہری۔ ہاں مگر تمہیں تو خوش رہنا
چاہیئے۔ تم کیوں سست رہتی ہو۔ میں نے تمہیں خوش نہیں رکھا......
میں.........میں" وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر وہ چپ ہو گیا اور
اس کی نقلی مسرّت شام کی آخری دھوپ کی طرح جو دیوار و در سے اچانک
غائب ہو جاتی ہے، روپوش ہو گئی۔ اس کا ہلکا سا سایہ اس کے چہرے پر اب
تک بیکسی سے منڈلا رہا تھا۔

"آج کل نمائش آئی ہوئی ہے۔ شام کو چلئے نا وہاں۔ دو گھڑی کے لئے
دل بہل جائے گا۔ آپ بھی کام کرتے کرتے تھک گئے ہیں۔" بیوی نے شوہر کی
افسردگی کو دور کرنے کے لئے کہا۔

"اچھا تم چلی جانا اگزبیشن۔ تم کہیں جاتی واتی بھی تو نہیں۔" شوہر نے
بیوی کی دلدہی کی۔

"کوئی لے جانے والا بھی تو ہو!" بیوی نے شکایت کو تیکھا بناتے
ہوئے جواب دیا۔

"بہت خوب! میں آج تمہیں لے چلوں گا۔"

جونیئر وکیل نے دھڑلے میں جواب دے دیا تھا۔ اس جواب کے
مطالبات اس پر اسی طرح واضح ہوئے جیسے موت یاد آجائے۔

دس بجے وکیل کچہری روانہ ہوا۔ آج اس کی ناکامیابی کی ساری الم سامانیاں اس پر اس طرح برس رہی تھیں جیسے کوئی سنگسار کیا جا رہا ہو۔ سڑک پر کے روڑے اس کے جذبات میں گڑ رہے تھے۔ وہ ایسا محسوس کر رہا تھا۔ ٹم ٹم، گاڑیاں، موٹریں اس کے سینے پر چل رہی ہیں۔ راہگیر اسے منڈلاتے ہوئے بھوت کی طرح معلوم ہو رہے تھے۔ چہروں سے اسے نفرت سی محسوس ہو رہی تھی۔ ہر شے اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ وہ اپنے کندھوں پر ہوا کا بوجھ تک محسوس کر رہا تھا۔ کبھی اس کا دماغ خیالات سے بری ہو جاتا۔ یکسر معطل اور کبھی خیالات اس طرح ہجوم کرکے آتے جیسے کسی تنگ گلی سے بہت بلوائی گزر رہے ہیں۔ "نمائش" یہ لفظ اس کے لئے پیامِ مرگ تھا۔ اس کی جیب میں ایک کھوٹی کوڑی تک نہیں تھی۔ گھر پر ایک دھیلا نہیں۔ اور کچہری سے کوئی امید نہیں۔ جونیر وکیل چلا جا رہا تھا، مایوس، بیزار، اداس، بازار میں اس نے ایک بندر نچانے والے کو دیکھا۔ اس نے سوچا "کاش! میں وکیل کی جگہ ایک قلندر ہی ہوتا۔ بندر ہونا بھی ناکامیاب وکیل ہونے سے بہتر ہے۔" اس نے ایسا محسوس کیا کہ نمائش گاہ بندروں کے ناچ کا بہت بڑا اکھاڑہ ہے اور وہ اس میں ناچنے والا ایک بڑا سا بندر "ڈگ ڈگ ڈگ ڈگ" بندر والے نے ڈگڈگی بجائی۔ سڑک پر کتے بھونکے، لڑکوں نے شور مچایا۔ جونیر وکیل کے دل میں ایک عجیب سی خواہش پیدا ہوئی۔ اس کا دل ناچنے کو چاہ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مجنونانہ ہنسی کے آثار پیدا ہوئے۔ وہ ایک زور کا قہقہہ لگاتے لگاتے محض اس لئے

بچا کہ اس کی توجہ دوسری طرف پھر گئی ۔۔۔ "یہ ہمالیہ کی جڑی بوٹیوں سے بنائی ہوئی دوا ہے ۔ بارہ برس گنگوتری اور بارہ برس نندا دیوی کے پرانی گپھاؤں میں ایک سادھو مہاتما نے جوگ سادھا ۔ تب رشی کھیش میں اسے آکاش بانی ہوئی ۔ یہ دوا انھیں سادھو مہاتما کے چرنوں کی سیوا سے ملی ہے ۔ بھائی لوگ غور سے سنیں ! مرگی ، بواسیر ، کنٹھ مالا ، سوزاک ، گرمی کوڑھ ، پرانا بخار ، کالا آزار ، ہیضہ ، چیچک ، پلیگ ، بادگولا ، زخم ، ناسور ، سانپ کا کاٹا ، بچھو کا ڈنک ، پرسوت کی بیماری ، کمر درد ، گٹھیا ، کون سا ایسا روگ ہے جس کا یہ علاج نہیں ۔ بھائی لوگ ! فائدہ نہیں ہونے سے پیسہ واپس ۔ اور بغیر و شواش کے کچھ لابھ نہیں ۔۔۔۔۔" وکیل کچہری کے احاطہ میں داخل ہو رہا تھا ۔ پیپل کے درخت کے نیچے ایک سڑک حکیم مسلسل ڈاکٹر گوئبلز کی طرح پروپیگنڈہ کر رہا تھا ۔ اس کے چاروں طرف ایک خلقت حلقہ باندھے کھڑی تھی ۔ وکیل بھی غیر ارادی طور پر وہاں کچھ دیر کے لئے کھڑا ہو گیا ۔ جب سڑک حکیم کی تقریر ختم ہوئی تو حلقہ سے نکل کر ایک شخص نے یہ کہتے ہوئے کہ ایک ہفتہ ہوا اس نے دوا لی تھی جس سے بہت فائدہ ہوا تھا ۔ مزید دوا خریدی ۔ پھر تو دھڑا دھڑ پیسے برسنے لگے ۔ جونیر وکیل کے منہ میں پانی آ گیا ۔ کاش ! وہ بھی سڑک حکیم ہوتا ۔ یہ سوچ کر وہ اتھاہ مایوسی کے تاریک کنوئیں میں ڈوب گیا ۔ اس کا سر چکرانے لگا ۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا ۔۔ اور اس اندھیرے میں "نمائش" کا لفظ اسے سانپ کی طرح گھور رہا تھا ۔

"اجی وکیل صاحب! کیا کر رہے ہیں آپ یہاں؟" ایک دلال کی آواز سے وکیل چونکا۔ اسے حجاب کا پسینہ آگیا۔

"کچہری ہی آرہا ہوں۔ ذرا یونہی کھڑا ہو گیا۔ ان فریبیوں کو تو دیکھو۔ گنواروں کو کیسا ٹھگتے ہیں۔......" وکیل مسلسل اپنے دل کا بخار سٹرک حکیموں کے خلاف نکالتا رہا۔ ناکامیاب کامیاب سے عموماً جلتے ہیں۔

وکیل نے اس روز دلال کی بہت خوشامدیں کیں۔ اتنی کہ گرگ باراں دیدہ موٹے چمڑے والے دلال کا دل بھی پسیج گیا۔

سہ پہر بھی ڈھل چکی تھی۔ کچہری کا شور و ہنگامہ کم ہو رہا تھا۔ پیپل کے درختوں کے نیچے کی آبادی گھٹ رہی تھی۔ اب "حاضر ہو!" کی آوازیں بھی معدوم تھیں۔ اور سڑکوں کی دھول کل تک کے لئے آرام لینے نیچے بیٹھ رہی تھی۔ جونیر وکیل وکالت خانہ کے برآمدہ پر ٹہلتے ٹہلتے جب تھک گیا تو کچہری کے احاطہ میں یوں ٹہلنے لگا جیسے کوئی غریب بھوکا اور در در کا ٹھکرایا ہوا کتا اپنی دم سکوڑے سر جھکائے چلتا ہے۔ سامنے سے دلال ایک نوجوان کو لئے آتا دکھائی دیا۔ جونیر وکیل اس طرف ایسا لپکا جیسے کوڑے کے ٹین کی طرف گرسنہ کتا لپکتا ہے۔

"کیا ہے بھائی نجابت! کوئی کام لائے ہو؟" وکیل نے گھبرا کر دریافت کیا۔ "ہاں وکیل صاحب! یہ حضرت اپنی سند کھو بیٹھے ہیں۔ بی۔ اے کی شاید۔ اب نوکری میں درخواست دے رہے ہیں۔ یونیورسٹی سے سند لینے کے لئے "آنی ڈیوٹ" کرانا ہے۔ بس آپ جانئے!" اور دلال

یہ کہہ کر چلا گیا۔

"چلئے وکیل صاحب سکھدیو بابو ڈپٹی مجسٹریٹ کے اجلاس پر آفی ڈیوٹ کرا دیجیئے۔ یہ رہی آپ کی فیس،" موکل نے چونی وکیل کی طرف بڑھائی۔ وکیل مبہوت رہ گیا۔ اور وہ مجسم احساس درد تھا۔

"اجی وکیل صاحب جلدی! اجلاس اٹھ نہ جائے۔ میں مختار صاحب سے اب تک کرا لیتا آفی ڈیوٹ۔ میاں نجابت مجھے یہاں لے آئے۔ چونی پر بہتیرے راضی ہیں۔ آپ کو کیوں تردد ہے؟ آئیے۔ چلئے!" موکل کو بس اپنے کام کی عجلت تھی وکیل کا یہ پہلا تجربہ تھا کہ وہ اتنا نیچے اتر رہا تھا۔ اس کی شخصیت لرز اٹھی۔ مگر حقائق کے مطالبہ کے سامنے اسے جھکنا پڑا۔ اس کے دماغ میں بہت سے خیالات آئے۔ اس کے دل میں بہت سے احساسات نے نشتر لگائے۔ آخرش سنجیدہ صورت منطق نے اس کی دستگیری کی۔ کم از کم نمائش جانے اور وہاں سے واپس آنے کے لئے رکشا کے کرایے تو ہو جائیں گے۔ یہ سوچ کر جونیر وکیل موکل کو لے کر اجلاس پر آفی ڈیوٹ کرانے چلا گیا اور چونی اس کی جیب میں اکلوتے بچے کی طرح چہیتی بنی ہوئی آرام کر رہی تھی۔

مِرزا جی لوکی والے

اِسی شہر لکھنؤ (جس کی شہرت کن کوّوں کے سبب ہے) کے قرب و جوار میں ایک پرانی وضع کے مرزا جی رہتے تھے۔ تھے تو مرزا جی، مگر آبائی پیشہ کھیتی باڑی تھا۔ گئے وقتوں میں بسراوقات اچھی مزے سے ہوتی تھی، لیکن انھوں نے گلوری، 'زردہ' دوپلّی اور اچکن کے شوق میں بہت سی زمین لالہ جی کی نذر کردی تھی۔ تاہم اس قدر اب بھی بچ رہی تھی کہ کھانے کے لئے دانے گھر آجاتے تھے۔

مرزا صاحب کا سِن و سال اس وقت پچاس سے تجاوز کر چکا تھا۔ لیکن پھر بھی چہرے پر رنگت موجود تھی۔ بہت اکڑ کر چلتے تھے۔ مونچھوں کو ہر وقت تاؤ دیتے رہتے اور فاختئی رنگ کی ریش مبارک کا بال بال نکھرا نظر آتا تھا۔ ریش کا رنگ فاختئی نظر آتا تھا، کیوں کہ آپ ایک خود ساختہ خضاب استعمال فرماتے تھے۔ گلوری چبا چبا کر گلّے پر کلّہ چڑھا ہوا تھا۔ جب دیکھو گائے کی طرح جگالی کر رہے ہیں۔ جہاں دو گھڑی کھڑے ہوئے جھکیو

پھینک پھینک کر خونِ شہیداں کا رنگ جما دیا۔ سر پر نہایت نازک دوپلی۔ گلے میں زعفرانی اچکن۔ کندھے پر سُرخ رومال بمبئی کا بُنا ہوا۔ چوڑی دار پاجامہ اور ڈیڑھ انگلی کا کام دار جوتہ، یہ آپ کا لباس تھا۔

سنّت نبویؐ کے لحاظ سے آنکھوں میں کاجل بھی لگایا کرتے تھے۔ لباس صاف سُتھرا ہو یا نہ ہو لیکن کیا مجال جو عطر لگانے میں ناغہ ہو جائے۔ بڑے متّقی اور پرہیز گار آدمی تھے، لیکن نماز روزہ سے چنداں لگاؤ نہ تھا۔ دوزخ کے تو وجود ہی سے انکاری تھے، لیکن جنت کے متعلق اُن کے خیالات نہایت لطیف تھے۔

خان دانی پیر جی سے بہت عقیدت تھی۔ پیر جی نے "اَلحق" کا وظیفہ بتا رکھا تھا۔ پہر رات رہے اپنے پلنگ پر بیٹھ کر اَلحق کا وِرد شروع کر دیتے اور گاہ گاہ جوشِ عقیدت کے ساتھ اس زور سے اَلحق کے نعرے لگاتے کہ غریب پڑوسی گھبرا کر "اَلامان" اور "الحفیظ" پڑھنے لگتے۔

چھوٹے بڑے سبھی آپ کو مرزا جی کہہ کر پکارتے تھے۔ ایک چھوکرا جس کا نام مرادی تھا، ہر وقت اردلی میں رہتا تھا۔

کھیتی باڑی کے لئے ایک ملازم تھا، لیکن پھل پھلواری کا کام اپنے ہاتھ سے بھی کر لیا کرتے تھے۔

مرادی کو حکم تھا کہ جدھر آپ جائیں وہ پیچھے پیچھے چلا کرے۔ آخر تھا تو چھوکرا ہی۔ چلتے چلتے کہیں لڑکوں کو کھیلتے دیکھ کر جو ذرا رک جاتا تو آپ بہت خفا ہو کر آواز دیتے۔

"ابے او مرادی! مرغی کے بچے۔ ابے اٹھا قدم۔ نہیں تو گردن توڑ دوں گا"۔ دس قدم چل لیتے تو "ابے او مرادی" کی ہانک لگا کر اطمینان کر لیتے کہ پیچھے چلا آتا ہے۔

انگرکھے یا اچکن کی جیب میں ایک دقیانوسی پوتھی ہر وقت پڑی رہتی تھی۔

~~~•~~~

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آپ کہیں سے لوکی کا بیج لے آئے۔ اور خود اپنے ہاتھ سے زمین میں بو دیا۔ بیج خریدنے اور بونے کی تاریخ پوتھی میں درج کر لی۔ بلا ناغہ کھیت پر تشریف لے جاتے اور بڑے غور سے نوزائیدہ پودوں کو ملاحظہ کیا کرتے۔

الغرض جب بیلوں میں پھول آئے اور لوکی لگی تو یہ تمام تاریخیں نہایت احتیاط سے پوتھی میں درج کر لی گئیں۔ آخر پیر جی کی دعا کی برکت سے لوکی پل کر پروان چڑھی۔ مرزا جی نے چند ایک نام بھی رکھ دیئے۔

مثلاً جھبری، جبدی، نوری، لعل یمنی وغیرہ لوکیوں کے
~~~

نام تھے اور کھیت میں جو سب سے بڑی تھی وہ پیر جی والی کہلاتی تھی - یہ سب نام بہی میں درج تھے - جب لوکی بڑی ہوئی تو مرادی کو حکم ملا کہ کھیت میں رہا کرے - گاہے گاہے حکم ملتا - "ابے دیکھ! مکھی مت بیٹھنے دے - مکھی بیٹھے گی تو کیڑا پیدا ہوگا"

جب تک مرزا جی کھیت میں رہتے، مرادی نہایت ہوشیاری سے مکھیاں اڑاتا پھرتا - لیکن آپ کے پیٹھ پھیرتے ہی کھیلوں میں مشغول ہو جاتا اور کبھی بھولے سے بھی لوکیوں کی طرف نہ دیکھتا -

آپ کا معمول تھا کہ کھیت میں آتے ہی اُن بڑے بڑے نام والوں کو بڑے شوق سے رومال سے صاف کرتے - بیلوں کو سلجھاتے اور گھر جاتے ہوئے ایک دو مرتبہ مُڑ مُڑ کر تاکید ضرور کر دیتے -

"ابے او مرادی! خبردار جو مکھی بیٹھنے دی"

فصل پک چکی تھی - گرد و پیش کے زمین دار ہر روز لوکی کی منڈی میں لے جاتے - لیکن مرزا جی کی لوکیاں یہاں مرادی کی نگرانی میں پرورش پا رہی تھیں - آخر ایک روز یہ قرار پایا کہ کل صبح اُٹھتے ہی "پیر جی والی" لا کر نیاز دے دیں گے اور پھر باقی منڈی میں فروخت کرنے کے لئے لے چلیں گے -

اگلے روز جو آپ مرادی کو ساتھ لے کر کھیت میں پہنچے تو یہ دیکھ کر سخت حیران ہوئے کہ ایک نہیں بلکہ پوری پچیس لوکی غائب

تھی - مرزا جی بہت سٹ پٹائے، پیشانی پر شکن پڑ گئی -

"ابے او مرادی! یہ کون لے گیا؟ ارے غضب - یہ جعفری، حیدری، نوری تو گئے ہی تھے، لیکن وہ ببرجی والی بھی غائب ہے"

اب لگے فکر کرنے کیا کیا جائے - آخر اس خیال سے کہ جو کوئی بھی لے گیا ہوگا، منڈی ہی میں لے جا کر فروخت کریگا - آپ نے چاقو سے جس قدر لوکی چوری ہوئی تھی، سب کے ڈنٹھل کاٹ کر رومال میں باندھ لیئے اور مرادی کو ساتھ لیئے ہوئے منڈی کی طرف چل کھڑے ہوئے - تھوڑی دور گئے تھے کہ جان پہچان کا ایک آدمی ملا -

"ارے مرزا جی! یہ صبح صبح بھاگے کہاں جا رہے ہیں آپ؟"

مرزا جی :- "ارے یار! کیا کہیں، کچھ روز ہوئے ہم رستم خاں کی دکان سے ...... اجی وہی رستم خاں دہلی والے ......"

"ہاں ہاں، فرمایئے - میں خوب جانتا ہوں"

"اجی وہی جن کے ہاں سے فصل کے سب بیج مل جاتے ہیں .... اور رستم خاں بیج والے مشہور ہیں - بھیّا! تم کو تو معلوم ہی ہوگا کہ اُن کا ایک کارخانہ دہلی میں بھی ہے اور دہلی شہر میں رستم خاں کے نام ہی سے دُکان چلتی ہے - یہ بھلے لوگ بمبئی احاطہ سے بیج منگواتے ہیں اور کمپنی بہادر کے وقت سے سات سمندر پار سے

جہازوں میں لد کر اُن کا مال آتا ہے "

"ہاں سمجھا، تو کیا ہوا —؟"

مرزا جی :— "اجی ابھی رستم خاں کے ہاں سے میں لونگ کے بیج لایا، خوب جھاڑ پھونک کر زمین میں گاڑا (اچکن کی جیب سے پوٹلی نکال کر) لو بھیّا، دیکھ لو اس میں سب کچھ درج ہے۔ تم تو پڑھے لکھے لوگ ہو"

"اجی مرزا جی۔ سب ٹھیک ہے۔ تو پھر؟"

" بھیّا کوئی شامت کا مارا راتوں رات ایک نہیں، بلکہ پوری پچیس لونگ چرا لے گیا۔ اب منڈی تلاش....."

آپ کا دوست جو اس طویل داستان سے تنگ آ گیا تھا۔ اس خوف سے کہ کہیں یہ امیر حمزہ کی دوسری داستان نہ ہو، بات کاٹ کر بولا :—

" تو حضرت جلدی کیجئے۔ ایسا نہ ہو کہ موقع ہاتھ سے نکل جائے۔"

کہتا ہوا یہ جا وہ جا۔

مرزا جی اس کی سرد مہری دیکھ کر بولے :—

" ابے او مرادی! دیکھا، زمانہ کس قدر بے مروت ہے؟ بھلا اِن لوگوں سے کیا توقع ہو سکتی ہے — چل اٹھا قدم۔ دیر ہوتی ہے"

اسی طرح تھوڑی دُور گئے تھے کہ ایک اور آشنا سا مل گیا اور

آپ کو پریشان حال دیکھ کر بولا :-

"اجی مرزاجی ! اجی حضرت ! سُنو تو، یہ کدھر بھاگے جاتے ہیں آپ ؟"

مرزاجی :- "بھیّا کیا کہوں، عجیب بپتا پڑی ہے"

"کیوں، خیر باشد !"

"وہ آپ کو معلوم ہی ہے نا، وہ جو شہر میں غریب رستم خاں ہیں - اجی وہی رستم خاں بیج والے"

"ہاں ہاں، جانتا ہوں - کیوں ان بے چاروں کو کیا ہوا ؟"

مرزاجی :- "اجی ان کا ایک کارخانہ دہلی میں بھی تو ہے نا - یہ بھلے مانس بمبئی احاطہ سے بیج منگواتے ہیں اور کمپنی بہادر کے وقتوں سے سات سمندر پار سے اُن کا مال جہازوں پر لد لدا کر آتا ہے ....."

"اماں یہ کسے معلوم نہیں، کیا ان کے یہاں چوری ہو گئی ؟"

"ارے توبہ، نہیں - میں اُن کے ہاں سے لوکی کے بیج لایا تھا - خوب جھاڑ پھونک کر زمین میں گاڑا - پیرجی کی دعا کی برکت سے فصل بہت اچھی ہوئی (پوٹلی نکال کر) لو، خود دیکھ لو - سب احوال درج ہے"

"ہاں ہاں، ٹھیک تو ہے - لیکن پھر ؟"

مرزاجی :- "آج رات کوئی مردود ایک نہیں پوری پچیس لوکی

چُرا کر لے گیا۔ اجی زمانہ کیا پوچھتے ہو......؟"

"تو آپ گویا منڈی جاتے ہیں تو جلدی کیجئے نا" یہ کہتے ہوئے یہ صاحب بھی اپنی راہ ہو لئے۔

مرزا جی کو دوست کی بے رُخی پر بہت افسوس ہوا۔ بولے:۔

"ابے او مرادی! دیکھا، اِس طرح کے ہوتے ہیں لوگ۔ کسی کے دُکھ درد کی کون پرواہ کرتا ہے۔ انھیں کہتے ہیں رسمی دوست۔ ابے او مرغی کے بچے، چل اٹھا قدم"

خیر، اسی طرح جو کوئی راستہ میں ملتا، مرزا جی اپنی کتھا شروع کر دیتے اور پوچھنے والے کو پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا۔

آخر آپ منڈی میں جا پہنچے۔ خیر سے ابھی لوگوں کا تم گھٹا لگا تھا۔ قسمت کی یاوری دیکھئے کہ جاتے ہی آپ کی نگاہ اپنے گم شدہ مال پر پڑی۔ سب لوگی پڑی تھی۔ یہ ایک دکان دار نے خریدی تھی۔ مرزا جی مرادی کو بازو پکڑ کر لوگی کی طرف اشارہ کرکے بولے:۔

"ابے دیکھ وہ جعفری سب سے اُوپر ہے۔ ہے نا؟ اور وہ پیر جی والی۔ ارے وہ دیکھ دائیں جانب۔ وہ رکھی ہے اور لوری وہ رہی۔ دیکھ لیا۔ ٹھیک ہے نا، سب ہی موجود ہیں"

اب آپ دونوں شانوں کو ایک خاص انداز سے اوپر نیچے ہلاتے اور نہایت مستقل طور پر قدم اُٹھاتے دُکان دار کے پاس پہنچے۔

"کیوں جی، یہ لوکی کہاں سے لی؟"

"یہیں منڈی سے"

مرزا جی:۔ "غلط کہتے ہو۔ یہ تو ہماری ہیں۔ لو دیکھ لو پرچی"

"ہوں گی، مگر ہم کیا جانیں۔ ہم نے تو دام دے کر خریدی ہیں"

مرزا جی:۔ "آئے بڑے دام دینے والے۔ کہتے کیوں نہیں چرائی ہیں۔ مسلمان ہو کم بخت، جھوٹ بولتے ہو صبح صبح ۔۔!"

دکان دار:۔ "کون، کس نے؟ یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟"

مرزا جی:۔ "کیا کہہ رہے ہیں ہم؟ ۔۔ تم چور ہو، اچکے ہو اور ۔۔ اور جانے کیا کہہ رہے ہیں ہم"

دکان دار:۔ کیا گھاس چرنے گئی ہے عقل۔ یہ سنبھالئے آپ اپنی زبان۔ ورنہ ۔۔"

مرزا جی:۔ لو جی ایک تو چوری اور پھر سینہ زوری۔ لگے ہم سے الٹے اکڑنے۔ (آستین چڑھا کر) پیر جی کی قسم سیدھا کر دیں گے ہم"

اتنے میں دس پانچ آدمی اور بھی آ گئے اور مرزا جی کو دیکھ کر بولے:۔

"ارے مرزا جی! اے حضرت، یہ کیا ماجرا ہے جو اس قدر بگڑ رہے ہیں آپ؟ ۔۔"

مرزا جی:۔ "لو دیکھو تماشہ۔ ابے او مرادی، یہاں کھڑے ہو پاس ہمارے"

ایک :۔ "اجی ہم بھی تو سنیں - آخر ماجرا کیا ہے ؟"

مرزا جی بولے :۔ "کیا کہیں آپ سے ہم - اجی وہ رستم خاں بیج والے جو اس شہر میں ہیں .... وہی جن کے ہاں سے سب قسم کے بیج مل جایا کرتے ہیں - آپ لوگ تو جانتے ہی ہوں گے ۔ دہلی شہر میں بھی ان کی ایک دکان ہے "

"ہاں یہ کسے معلوم نہیں ، لیکن ہوا کیا ؟"

مرزا جی :۔ "بھیا ! یہ غریب رستم خاں والے بمبئی احاطہ سے بیج منگواتے ہیں اور کمپنی بہادر کے وقت سے سات سمندر پار سے ان کا مال جہازوں میں لد کر یہاں آتا ہے - کچھ روز ہوئے ہم بھی ان کے ہاں سے لوکی کے بیج لائے تھے - خوب جھاڑ پھونک کر تخم ریزی کی - آخر پیر جی کی دعا کی برکت سے فصل تیار ہوئی - ارادہ تھا کہ آج پہلے پیر جی کی نیاز دیں گے اور پھر فصل کاٹ کر منڈی میں فروخت کریں گے ، لیکن اس کم بخت نے راتوں رات ایک نہیں بلکہ پوری پچیس لوکی چرالی - لو دیکھو ، یہ رکھی ہیں سب "

ایک شخص نے دکان دار سے پوچھا :۔

"یہ کس سے خریدی ہیں آپ نے ؟"

خریدار :۔ یہاں ایک ہی نوجوان کھڑا بیچتا تھا ۔ اس سے لے لیں "

مرزا جی :۔ "الغلط ۔ اب لگے باتیں بنانے "

ابھی اس قسم کی باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک نوجوان کسان رمضانی نام جو مرزا جی کے پڑوس ہی میں رہتا تھا، کہیں سے گھومتا آ نکلا۔ خریدار نے اسی رمضانی سے لوکی لی تھی۔ لپک کر اسے پکڑ لیا۔

"لو جی پوچھ لو اس سے۔ اسی سے خریدی ہیں"

مرزا جی نے جو رمضانی کو دیکھا تو غصہ سے لال ہو کر بولے —

"کیوں بے رمضانی! یہ ہماری ہی لوکی چرائی تھی؟"

رمضانی:— "تو کیا ہمارے کھیت میں لوکی کم ہیں، آئے بڑے لوکی والے"

مرزا جی:— "ہوں گی، ہیں کیا یہ تو ہماری ہیں (جیب سے پوتھی نکال کر)۔ لو دیکھ لو پوتھی۔ سب اس میں درج ہے"

رمضانی:— "پوتھی کو کیا جانیں ہم۔ آئے بڑے پوتھی لے کر"

مرزا جی:— "ابے اس کی شہادت تو رستم خاں والے بھی دیں گے کہ ہم ان کے ہاں سے بیج لائے تھے"

رمضانی:— "سبھی وہیں سے لاتے ہیں۔ آپ لے آئے تو کیا آسمان پھٹ پڑا؟"

مرزا جی:— "کیسا بے شعور ہے۔ بزرگوں سے بات کرنے کا سلیقہ بھی نہیں"

اب اور لوگوں نے بھی دخل دیا اور مرزا جی کو سمجھانے لگے کہ "حضرت مفت میں کیوں جھگڑتے ہیں آپ۔ آخر اس بات کا کچھ

ثبوت بھی ہے کہ یہ لوکیاں آپ ہی کے کھیت سے کٹ کر آئی ہیں۔ پوتھی کو کون پوچھتا ہے؟"

مرزاجی :۔ "تو گویا آپ ثبوت چاہتے ہیں۔ یہی نا۔"

یہ کہہ کر مرزاجی وہیں بیٹھ گئے اور بغل میں جو ایک چھوٹی سی گٹھری دبا رکھی تھی، زمین پر رکھ کر لگے اس کی گرہیں کھولنے۔

مجمع میں سے ایک نے آواز دی :۔

"سانپ نکلے گا، بابی سے خبردار رہیو بھیّا۔"

مرزاجی نے بہ ہزار دِقّت رومال کی گرہیں کھولیں۔ اب لوگ دیکھتے کیا ہیں کہ بہت سے ڈنٹھل پڑے ہیں۔

"ابے او مرادی! لائیو اِدھر وہ پہلے بیرجی والا" چھوکرا ایک بہت بڑی لوکی اٹھا لایا اور مرزاجی ڈنٹھل اٹھا اٹھا کر کٹی ہوئی جگہ پر جمانے لگے۔ آخر ایک ڈنٹھل بیٹھ گیا۔ مرزاجی نے اسے ایک طرف رکھ دیا۔

"لائیو تو اِدھر وہ جعفری"

مرادی نے ایک اور لوکی لا کر سامنے رکھ دی اور مرزاجی نے اس پر بھی ایک ڈنٹھل جما دیا۔ اس طرح نوری اور حیدری کے بھی ڈنٹھل اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔

اب تو لوگوں کو بھی ایک مشغلہ ہاتھ آ گیا۔ وہ بھی ایک ایک دو دو ڈنٹھل اٹھا اٹھا کر لوکیوں پر جمانے لگے۔ تماشائیوں کا ہجوم

تھا اور ایک طوفان بے تمیزی برپا تھا — اور ہر طرف سے "اجی مرزا جی یہ لیجئے یہ رہا" "اے مرزا جی نہ بیٹھا" "لو دیکھنا یہ رہا"

یہی آوازیں ہر طرف سے آنے لگیں۔ اس طرح بچیس ڈنٹھل جو مرزا جی بیلوں سے کاٹ کر لائے تھے لوگوں پر جم گئے اور اب ہر طرف سے "اجی مرزا جی کمال کر دکھایا، بھئی حد ہو گئی"

اور ادھر مرزا جی جھک جھک کر "تسلیمات عرض۔ یہ تو آپ کی ذرہ نوازی ہے"

ایک "اجی مرزا جی! خدا کی قسم آئیے گلے تو مل لیں"

اب دیوانہ وار لوگ آگے بڑھ بڑھ کر مرزا جی سے گلے ملنے لگے۔ دکان دار کو خوف تھا کہ کہیں چوری کا مال خریدنے کے جرم میں نہ دھر لیا جاؤں۔ جیب سے دو روپے نکال کر آگے بڑھا اور بولا "اجی مرزا جی! اے حضرت، سنئے تو۔ لو مبارک ہو۔ گیا ہوا مال مل گیا"

آخر مرزا جی لوگوں سے ہٹ کر رمضانی کو کان سے پکڑ کر بولے — "کیوں بے! بول اب۔ پہنچا دیں کال کوٹھری میں، چھ ماہ کے لئے"

لوگوں نے کہا:—

"اے مرزا جی! کیا سنا نہیں آپ نے۔ بزرگوں کا کہا ہوا:—

از خرداں خطا و بزرگاں عطا"

رمضانی نے جو روپے دکان دار سے لیے تھے، وہ آپ کو واپس دے دیے۔ اِدھر دکان دار نے بھی آپ کی مٹھی گرما دی۔ مرزا جی نوکر کی طرف دیکھ کر بولے :۔

"ابے او مرادی! کیوں ٹھیک کہا تھا نا ہم نے۔ دیکھی پیر جی کی کرامت! لے اٹھ، اب گھر چل، وہ کھڑی راہ تکتی ہوں گی!"

اِدھر مرزا جی نے پیٹھ موڑی، اُدھر لوگوں نے "مرزا جی لو کی والے" کی ہانک لگائی۔

یہ تھے اگلے وقتوں کے لوگ۔ لیکن اب ایسے پابندِ وضع بزرگ کہاں؟

الاؤ

گاؤں سے پورب کو ایک بڑا سا میدان ہے۔ کھیت کی سطح سے کچھ اونچا اور چورس۔ لوگ کہتے ہیں کہ پرانے زمانے میں کسی راجہ کا یہاں پر راج محل تھا۔ اس کی مٹی اور اینٹ سے زمین اونچی ہو گئی ہے۔ میدان کے پوربی کنارے پر پیپل اور برگد کے پیڑ ہیں اور اس کے بعد کھیت۔ اُتر کی طرف ناگ پھنی کی گھنی اور لمبی قطار ہے اس کے بیچ میں کئی نیم یا پاکڑ کے پیڑ، اور اس کے بعد دکھن میں ایک کنارے پر ایک پیپل کا پیڑ ہے۔ اس کے پاس ہی ایک کنواں اور اس کے بعد ایک کھیت۔ پورب دکھن کونے پر ایک بڑا سا گڑھا ہے جس میں برسات کا پانی جمع ہو کر کئی مہینے رہا کرتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں راج محل کا یہ پوکھر تھا۔ اس میں رانی اپنی سہیلیوں کے ساتھ نہایا کرتی تھی۔ نہانے سے پہلے پوکھر میں گلاب کا عرق ڈال دیا جاتا تھا۔ جس کی مہک دور دور تک پھیل جاتی تھی۔ چاندنی راتوں میں راجہ اور رانی دونوں ناؤ پر اس پوکھر پر سیر کیا کرتے تھے۔ یہ پوکھر بہت بڑا تھا بھرتے بھرتے بھر گیا اور جو نشان باقی رہ گیا ہے وہ بھی راجہ اور راج محل کی طرح مٹ جائے گا۔

گاؤں میں اب کسان ہی کسان رہتے ہیں۔ پر جا ہی پر جا ــــــــ راجہ
کو مرے، برباد ہوئے تو زمانہ بیت گیا، اس کا راج محل تو میدان ہے۔
یہ میدان گاؤں والوں کے لئے سب کچھ ہے۔ ہر روز سارے گاؤں
کے ڈھور اس میدان میں جمع ہوتے ہیں۔ لوگ اپنی اپنی بھینسوں کو کنوئیں پر
دھوتے ہیں پھر گھر لے جاتے ہیں۔ فصل کٹنے پر کھلیان لگاتے ہیں۔ رو کھ
پیڑ نے کو کولہو بٹھاتے ہیں گولہو سار بنلتے ہیں۔ گاؤں کے لڑکے صبح سے
شام تک کھیلتے اور بڑے بوڑھے کسی پیڑ کے نیچے بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔

کارتک کا مہینہ تھا۔ ٹھنڈک اچھی خاصی پڑنے لگی تھی اور میدان میں
کتکی دھان کا کھلیان لگایا جانے لگا تھا۔ گاؤں میں نئی زندگی پھیلی ہوئی تھی۔
کچھ لڑکے میدان میں کبڈی کھیل رہے تھے۔ عورتیں کنوئیں سے پانی
بھر کر اپنے گھروں کو لے جا رہی تھیں۔ بھگو اپورب کی طرف آگ جلا کر اپنی لاٹھی
کو سینک کر سیدھا کر رہا تھا۔ اسی دن وہ اپنی بہن کے گھر دھرم پور سے آیا تھا۔
بہنوئی نے چلتے وقت یہ لاٹھی اپنی بسواڑی میں سے کاٹ کر دی تھی۔ لاٹھی نیچے
کی طرف سے ذرا ٹیڑھی تھی اس کا سیدھا کرنا ضروری تھا۔
بھگوا نے لاٹھی سیدھی کرنے کو الاؤ جلا رکھا تھا۔ پہلے لاٹھی کو سینک کر
پھر پیپل کی چیڑ میں پھنسا کر اسے سیدھا کرتا۔ وہ اپنی بہن کے یہاں سے ایک
گیت سیکھ کر آیا تھا۔ اس گیت کو ہلکے ہلکے سروں میں گاتا جا رہا تھا۔ ساتھ ہی
اس کے دماغ پر بہت باتیں گھوم رہی تھیں۔ سب سے زیادہ یہ کہ گاؤں میں

بہت بڑی سبھا ہونی چاہئے۔ ٹھیک ویسی ہی، یا اس سے بھی بڑی جیسی اسکی بہن کی سسرال میں ہوئی تھی اور اس سبھا میں وہ کھڑا ہو کر کل لوگوں کو ساری باتیں سمجھائے، جیسے وہاں ایک آدمی نے سمجھایا تھا۔

پھگوا اپنے خیالوں میں مگن تھا کہ اکلو آ گیا۔ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا اور گاؤں کے ناطے میں پھگوا کا چچا تھا۔ اکلو نے آتے ہی کہا:۔

"بیٹا لاٹھی تو اچھی ہے مگر اس میں گڑا سا لگے تب ہ"

پھگوا نے پلٹ کر دیکھا اور بولا:۔

"ہاں چچا پر گڑا سا اچھا سا مل جائے تب نا"

شام ہو چکی تھی۔ دھیرے دھیرے اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ لاٹھی سیدھی ہو چکی تھی۔ اس نے خوب گھما گھما کر لاٹھی کو دیکھا۔ پھر پیپل کے پیڑ کے سہارے کھڑا ہو کر دو قدم پیچھے ہٹ کر دیکھنے لگا۔ اکلو بھی لاٹھی کو ایک خاص نظر سے دیکھتا رہا جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ لاٹھی اچھی ہے اور اگر گڑا سا مل جائے تو بہت اچھا ہو۔

ابھی لاٹھی کو یہ دونوں دیکھ ہی رہے تھے کہ سامو اور باڑھو بھی گھومتے پھرتے آ گئے۔ باڑھو نے آتے ہی کہا:۔

"ارے بھیا! ابھی اتنا جاڑا تو نہیں پڑا۔ ابھی سے الاؤ تاپنے لگے؟"

اکلو بولا:۔

"پھاگوا اپنی لاٹھی سیدھی کر رہا تھا، الاؤ کون تاپے گا ابھی"

باڑھو بولا:۔

"مگر آگ بھلی معلوم ہوتی ہے بھائی۔"

وہ آگ کے پاس بیٹھ گیا اور آگ تاپنے لگا۔ اس کے بیٹھتے ہی اور لوگ بھی بیٹھ گئے۔ ساتول اسی طرف آ رہا تھا اور ان لوگوں کی باتیں سُن چکا تھا۔ وہ آتے ہی بولا:۔

"واہ بارھو چچا! پہلے تو دوسرے کو ٹوکا اور سب سے پہلے بیٹھ بھی آگ تاپنے، واہ!"

بارھو بولا:۔

"ہاں بیٹا! اب آگ بھلی معلوم ہوتی ہے، اور ہم نے ٹوکا کب تھا۔ ارے ایسے ہی بول رہا تھا۔"

سب کے سب آگ تاپنے لگے۔ آگ ابھی زیادہ تھی اس لئے کچھ دور ہی دور بیٹھے۔ بارھو نے پاؤں پھیلاتے ہوئے کہا:۔

"ارے یہ لونڈے سب اتنے بدمعاش ہوتے جا رہے ہیں کہ کیا کہا جائے۔"

ساتول نے کہا:۔

"کیا چچا! ہم لوگوں نے تو کوئی بدمعاشی نہیں کی۔"

بارھو بولا:۔

"نہیں، تم سب کی باتیں نہیں۔ یہی تو میرا کہنا ہے۔ تم سب جوان اور بال بچے والے ہوئے۔ کبھی کوئی اونچی نیچی بات دیکھنے میں نہ آئی۔ پر اب کی تو دُنیا ہی بدلتی جا رہی ہے۔ دیکھ ابھی راستے میں آ رہے تھے تو دیکھا کہ چھپی اور چھیدو کے دونوں لڑکے ریڑ (ارنڈ) کی ڈنٹھل جلا کر بیڑی کی طرح بھک بھک کھینچ کر

دُھواں اُڑا رہے ہیں۔ ڈانٹا تو دونوں کھانستے ہوئے بھاگے۔ سب کا کلیجہ جل جائیگا"

اتنے میں چھپی آ گیا اور باڑھو نے اس سے بھی یہ بات دہرا دی لیکن چھپی نے کہا:

"بھیا۔ اب او جمانا ہی نہ رہا۔ ہم سب بھی کبھی لڑکے تھے۔ ایک دفعہ کا قصّہ سنو گے تو دنگ رہ جاؤ گے۔ ابھی کل کی بات ہے، ہم میدان سے آ رہے تھے، میرے ہاتھ میں لوٹا تھا۔ خیال ہوا کہ بڑے کنوئیں پر لوٹا مانجھ کر پانی بھر لیں ۔ جیسے ہی کنوئیں پر پہونچے تو دیکھا ریتو کلوا کی عورت کا راستہ روکے کھڑا ہے۔ وہ کہہ رہی ہے جانے دو ریتو، تو کہتا ہے ایسے نہیں بھوجی۔ ویسے کہو۔ ع

موری راہ چھوڑ دو گردھاری دیر ہوئی

یاد ہے کرشن لیلا والا گانا۔ جب اس نے بالٹی اُٹھا کر کہا کہ سارا پانی اُچھل دوں گی، تو راستے سے بھاگا۔"

"چچا یہ بھی کوئی بات ہے، بھوجائی ہے وہ ہنسی ٹھٹھا کرتا ہوگا ـــــ جانتے ہی ہو ریتو کیسا ہنسوڑ ہے۔"

لیکن چھپی نے بزرگانہ انداز میں کہا:۔

"ہش! یہ بھی کیا ٹھٹھا ہے۔ ایسے ہی لڑکے خراب ہو جاتے ہیں۔ یہ تو ہم نے دیکھا تھا۔ دوسرا دیکھ لیتا تو نہ جانے کتنی باتیں جوڑ کر کہتا اور بدنامی ہوتی۔ گاؤں میں ایسی بات کبھی نہیں ہوئی۔"

سانول چُپ ہو گیا اور باڑھو نہ جانے کب تک بولتا رہتا لیکن سانول نے بیچ ہی میں روک کر کہا:۔

"ارے بھاگو تو نے تو کچھ کہا نہیں۔ سُنا ہے دھرمپور میں بڑی بڑی سبھا

ہوئی۔ بڑے بڑے لوگ جمع ہوئے۔ کسانوں کے فائدہ کی بات ہوئی "

پھاگو نے اس انداز سے سب پر نگاہ ڈالی جیسے وہی اکیلا سب کچھ جانتا ہے۔ باقی سب کاٹھ کے الّو ہیں۔ پھر بولا:۔

"ہاں بہت بڑی سبھا ہوئی تھی۔ ایک سادھو جی بھی آئے تھے۔ وہ سب کو ایک بات کہہ گئے۔ سب کسان ایک ہو جائیں۔ آپس میں مِل جُل کر رہیں۔ تب ہی زمیندار کے ظلم سے بچ سکتے ہیں"

ساؤں بولا:۔

"بھیا بات پتے کی ہے، ہم لوگوں پر جتنا ظلم ہوتا ہے اسے کون جانے۔ سال بھر محنت کر کے اُپجاتے ہیں اور ہمارے ہی بال بچے بھوکوں مرتے ہیں"

"آگ کچھ دھیمی ہو چلی تھی اس لئے باڑھو کچھ اور بھی آگ سے قریب ہو گیا اور بولا:۔

"بات تو ٹھیک ہے پر ہونا مشکل ہے نا"

پھاگو بولا:۔

"مشکل کیا ہے؟ آج سے ہم لوگ ٹھان لیں کہ آپس میں مِل جُل کر رہیں گے۔ زمیندار کو بیگار نہیں دیں گے۔ کوئی ناجائز دباؤ نہیں سہیں گے۔ بس! ادھر پورب میں تو ایسا ہی ہوا ہے۔ اب تو وہاں چین ہی چین ہے"

ابھی بات آگے نہیں بڑھی تھی کہ طوفانی میاں آ گئے۔ یہ بوڑھے آدمی تھے۔ اور تیس برس سے گاؤں میں کرگھہ چلاتے تھے۔ طوفانی میاں نے آتے ہی اپنا ٹھریا (معمولی قسم کا حقہ) رکھ کر ایک دم لگایا اور اس انداز سے سب کی طرف

متوجہ ہوئے جیسے ایک مجسٹریٹ وکیلوں کی بحث سننے کے لیے تیار ہو۔ لیکن طوفانی میاں کو متوجہ دیکھ کر سب چُپ ہو گئے، جیسے اب وہ کچھ کہنے والے تھے

"ارے سب چُپ ہو گئے، بات کیا تھی؟"

سانول نے جواب دیا:۔

"پھاگو دھر پسوار گیا تھا طوفانی چچا، وریں کی بات تھی"

"کیا بات تھی؟"

طوفانی میاں نے اس انداز سے سوال کیا جیسے اگر انہیں نہ بتایا گیا تو پھر کوئی بات ہوئی ہی نہیں۔ سب کا سننا بے کار ہوا۔ پھاگو نے پھر سے ساری بات دہرائی۔

طوفانی میاں نے حقّے کا لمبا دم لگا کر بزرگانہ انداز میں کہا:۔

"بات تو ٹھیک ہے۔ مگر بھائی یہ کرم کی لکھی باتیں ہیں۔ آدمی کیا کر سکتا ہے۔ یہ سب خدائی کارخانہ ہے"

طوفانی میاں نے ایک ہی جملے میں سب کی ہمّت توڑ دی۔ اب بھلا خدائی کارخانے میں بحث کرنے کا سوال کیسے پیدا ہوتا۔ چھکوّ تیلی نے کہا:۔

"طوفانی میاں نے سولہ آنے ٹھیک بات کہی ہے۔ پرماتما نے سدا کے لئے آدمی کو چھوٹا بڑا بنایا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اپنا کام ہی نہ چلتا۔"

چھٹو دھوبی نے اور آگے بڑھ کر داد دی اور کہا:

"ہونہہ اگر جمیندار نہ رہے گا تو کون رہے گا؟ سب جمیندار ہو جائیں گے تو پھر کھیتی کون کرے گا؟"

دلو چپ چاپ بیٹھا سُن رہا تھا۔ وہ بڑا جوشیلا تھا۔ سب کی باتیں سُنکر اس کا خون کھول رہا تھا۔ لیکن اس کا چچا طوفانی بیٹھا تھا۔ بات آ آ کر اس کے ہونٹوں پر رُک جاتی تھی۔ لیکن اب اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ اس نے کہا:۔

"اپنے کئے سب کچھ ہو سکتا ہے"

طوفانی میاں نے اور ان کے ساتھ دوسروں نے اس کو آنکھیں نکال کر دیکھا وہ حال ہی میں کلکتہ سے آیا تھا۔ کلکتہ میں وہ جہاز گھاٹ پر قلی کا کام کرتا تھا۔ دن رات محنت۔ چین، جاپان اور امریکہ سے آیا ہوا مال جہاز سے اُتارا کرتا تھا۔ اس کو کمپنی سے روز جھگڑنا پڑتا تھا۔ وہ پہلے کئی ہڑتالوں میں شریک ہو چکا تھا۔ اور وہ دیہات میں زمینداروں کے ظلم سے بھی واقف تھا، اس نے کہا:۔

"ہم لوگوں کو اب تیار ہونا ہی پڑے گا"

سانول نے کہا:۔

"ٹھیک کہتے ہو دلو ——"

طوفانی میاں نے قہر آلود نگاہوں سے دلو کو دیکھا اور بڑبڑاتے ہوئے اُٹھے "سچ ہے کلکتہ جانے سے آدمی کا دماگ خراب ہو جاتا ہے" اس کے ساتھ ہی پھٹو اور جھگو اور ایک دو آدمی اُٹھ کر چلے گئے اور اس انداز سے جیسے اس جگہ پر کوئی آفت آنے والی ہے۔ لیکن ان لوگوں کو اس کی پروا نہ ہوئی، بلکہ سانول نے کہا "جلم پر جلم ہے، پرسوں ہی کی بات ہے۔ میگھو کو پٹواری جی نے مارا ہے۔ بات یہ تھی کہ پٹواری جی چاہتے تھے میگھو کی عورت آکر ان کا چوکا کرے اور اس نے انکار کر دیا"

"یہ سب اب نہیں چل سکتا۔ کل میگھو کو کہا جائے کہ وہ بھی کام کرنے نہ جائے۔"

دلو نے رائے پیش کی اور سب نے ہاں کہی۔ پھر آگے چل کر کیا ہوگا؟ اس پر بھی بحث رہی لیکن سب نے نتیجے سے بے پرواہ ہو کر یہی فیصلہ کیا کہ پٹواری جی کو رسیدانہ نہ دیا جائے۔ دباؤ ڈال کر دودھ گھی وصول کر لیتے ہیں، وہ بھی بند اور بیگاری آخری طور پر ختم ——"

"بیگار ختم" کہتے وقت دلو نے تھوڑا سا کوڑا کرکٹ اٹھا کر الاؤ میں ڈال دیا۔ الاؤ سے پھر ایک بار تھوڑی سی آگ بلند ہوئی اور بجھ گئی۔

سانول نے کہا:۔

"تب دلو ٹھیک ہے نا؟"

دلو نے کہا:۔

"پکا بات ہے بھائی، مرد بات سے نہیں پلٹتا۔"

بھاگو نے کہا —— "بالکل ٹھیک۔"

پھر سیتل بولا:۔

"لیکن دلو بھیا۔ وہ جو پنڈت جی آتے ہیں نا کہتے تھے تم سب چپ چاپ بیٹھے رہو۔ یہ سب کام کانگریس کر دے گی۔"

سیتل کے بولنے سے جمن کو بھی ہمت ہوئی۔ وہ بھی اپنے ماموں کے گھر گیا تھا۔ وہاں مسلمانوں کا ایک بڑا جلسہ ہوا تھا جس میں کانگریس کی برائیاں وہ سن چکا تھا اس نے کہا:۔

"دلو بھائی ـــــ کانگریس ـــــ مولانا صاحب تو کہتے تھے ۔"

دلو نے ذرا تیکھے انداز میں کہا:۔

"دھت ۔ یہ سب بکتے ہیں ۔ غریب کا کوئی سالا نہیں ہوتا ۔ اپنے کرنا ہوگا جو ہوگا"
یہ کہتے ہوئے دلو اُٹھ کھڑا ہوا ۔ رات بھی کافی جا چکی تھی، الاؤ بھی بجھ چکا
تھا اور فضا میں ٹھنڈک کافی پیدا ہو چکی تھی، دلو کے اُٹھتے ہی رب کے سب اُٹھ گئے۔

دوسرے دن صبح سے سارے گاؤں میں ہلچل تھی ۔ بوڑھے بچے اور جوان
سب کے سب کچھ نہ کچھ اسی قسم کی باتیں کرتے تھے ۔ جوان تو ہر دروازے پر
کہتے پھرتے تھے :" آج سبھا ہوگی "۔ بچے تماشا سمجھ رہے تھے اور بوڑھے نتیجہ
پر غور کر رہے تھے کہ بھُس میں چنگاری پھر گئی ۔ پٹواری نے اندر مہتوں اور
طوطارام کو بلا کر خوب ڈانٹا، گالیاں دیں اور صاف صاف کہہ دیا کہ اگر اس
سال تم لوگوں نے بقایا بے باق نہیں کر دیا تو کھلیان سے ایک دانہ بھی اُٹھا کر نہ
لے جا سکے گا ـــــ اس سے جوش اور بھی بڑھ گیا۔

شام کو دو چار نوجوان میدان میں جمع ہوئے، مگر زیادہ لوگ کترا کر
نکل گئے ۔ سبھا کرنے والوں کو سخت غصہ ہوا ۔ وہ سب کے گھروں میں پھر گئے
اور سب سے کہا" سب کا حشر طوطارام اور اندر مہتوں کا ہوگا ۔ تم سب چمڑیوں
لولی کی طرح چیں چیں کرتے رہ جاؤ گے اور پٹواری تمہیں باز کی طرح ہر
روز شکار کرے گا، آج وہ، کل وہ "

صبح اُٹھ کر سانول منہ دھونے بیٹھا تھا کہ پیادے نے آکر کہا:۔

"سانول بھائی! تمہیں پٹواری جی نے بلایا ہے، کوئی ضروری بات ہے"

سانول کا ماتھا ٹھنکا تو ضرور، لیکن وہ چور نہیں تھا جو مُنہ چھپاتا۔ مُنہ ہاتھ دھو کر اس نے کچھ کھایا پیا اور کچہری کی طرف چلا۔ راستے میں اُسے خیال آیا کہ اس کی خبر دلو کو بھی کرتا جائے۔ جیسے ہی دلو کے گھر کی طرف مڑا، پھاگو اور دلو آتے دکھائی پڑے۔ پھاگو نے دلو کو دیکھتے ہی کہا:۔

"بھیا جانتے ہو کہ کچہری سے بلاوا آیا تھا۔ گماشتہ جی بھی آئے ہوئے ہیں اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ مالک سے کوئی خاص حکم لے کر آئے ہیں ——

کیا رائے ہے —— ؟"

سانول نے جواب دیا:۔

"چلو تمہارے دالان میں بیٹھ کر بات کریں گے۔"

تینوں گئے اور بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ پھاگو نے یہ بھی بتایا کہ ان کی ساری باتیں پٹواری کے کانوں تک چھٹو دھوبی پہنچا دیتا ہے۔ اس سے سانول کو بڑا غصہ آیا اور وہ بولا:۔

"دو سالے کو پکڑ کر چار لاٹھی۔ ہم لوگ سے کچھ کھود کھود کر بات پوچھتا ہے اور اپنے باوا کو کہہ آتا ہے۔ حرامی!"

دلو نے کہا:۔

"غصہ کرنے کی بات نہیں سانول۔ کام کرنا ہے۔ دھیرج سے کام کرنا ہوگا۔"

سانول نے کہا:۔

"ایسے سالوں کو سزا ضرور ملنی چاہئیے۔"

پھاگو نے پوچھا:۔

"تو اب کیا ہو گا؟"

ساتول نے کہا:-

"ڈرنے کی بات کیا ہے۔ ٹھہرو پٹواری نے بلایا ہے، وہاں سے ہو آؤں۔ دیکھوں بات کیا ہے؟"

ساتول چلا گیا۔ دلو اور بھاگو کچہری سے ہو کر آئے تھے۔ ان دونوں پر ڈانٹ پڑ چکی تھی۔ لیکن ان دونوں نے ساتول سے باتیں اس لئے نہیں کہیں کہ وہ اور بھی غصّہ ہو جائے گا۔ ذرا سی بات میں اس کو غصّہ آجاتا ہے اور روکنے کی کوشش اس لئے نہ کی کہ وہ ہرگز نہ رکتا۔ بلکہ بات اور بھی بڑھنے کا ڈر تھا۔ وہ دونوں دیر تک چپ رہے لیکن بھاگو نے کہا:

"دلو بھائی ساتول کو وہاں نہ جانے دینا۔ گماشتہ جی اگر ٹیڑھے ہو کر بولیں گے تو ساتول بھیا نہیں سہہ سکتے۔ وہ تیکھے مزاج کے آدمی ہیں"

دلو نے ایک لمبے سانس کے ساتھ کہا:-

"یہ ٹھیک ہے۔ پر نہ جانے پر بھی تو بات بڑھتی۔ اب جو بھی ہو دیکھا جائیگا"

بھاگو بولا:-

"پھر بھی......"

یکایک وہ چپ ہو گیا۔ ساتول تیزی کے ساتھ سامنے سے آرہا تھا۔ اس کا چہرہ لال ہو رہا تھا اور دھوتی پھٹی ہوئی تھی۔ ابھی وہ دلو سے کچھ کہہ بھی نہ سکا تھا کہ دلو آگیا اور آتے ہی بولا:-

"بھاگو لاٹھی تو دے ——"

دلو نوں پھاگو دونوں کھڑے ہو گئے۔ دونوں نے سانول کو سمجھایا مگر وہ تنتنا جا رہا تھا ——— اس نے بتایا کہ وہاں پٹواری اور گماشتہ نے ڈانٹا۔ بات بڑھی۔ اس پر گماشتہ نے پھاٹک بند کروا دیا اور چاہتا تھا کہ مار پیٹ کرے مگر وہ اس طرف کی دیوار کو نیچی ہے، پھاند کر بھاگ آیا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ چھٹو اور جھبی حجام سارے فساد کی جڑ ہیں اور وہ ان دونوں سے بدلہ ضرور لے گا۔

دلو ہوشیار آدمی تھا اس نے سانول کو ایک کمرے میں بند کر دیا اور باہر سے کنڈی لگا دی۔ پھاگو کچھ جوش میں تھا اور کچھ ڈر رہا تھا۔ دلو پر کوئی خاص اثر نہ تھا۔ وہ ایسے جھگڑے کلکتہ میں بار بار دیکھ چکا تھا۔ پھاگو کے لئے بات نئی تھی۔ جوش تو ضرور تھا مگر ایک تو دل کا کچا تھا اور دوسرے سمجھ بھی زیادہ نہ تھی۔ وہ گھبرا کر دلو کا منہ دیکھنے لگا۔ پھر بولا:۔

"اب کیا ہو گا دلو بھائی؟"

دلو بولا:۔

"دیکھا جائے گا ———"

اتنے میں گاؤں کے کچھ بڑے بوڑھے آ گئے اور لگے دونوں کو سمجھانے۔ دلو سب کی بات کا ٹھنڈے دل سے جواب دیتا گیا۔ سب سے یہ بھی کہہ دیا کہ اب کوئی بات نہ ہو گی۔ سانول چلا گیا۔ جب کچھ جوان آدمی آئے تو ان سے بولا:

"بولو اب کیا ارادہ ہے، اب عزت چاہتے ہو یا ذلت؟"

ذلت کون چاہتا ہے؟ سب نے کہا کہ کچھ بھی ہو ہم ساتھ دیں گے لیکن

دلو نے سب کو سمجھایا کہ کوئی اونچی نیچی بات نہ ہونے پائے۔ اب صرف کام یہ کرنا ہے کہ آس پاس کے گاؤں میں لوگوں کو تیار کیا جائے۔ ابھی بات ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ کچہری سے زمیندار کے پیادے لاٹھیاں لے کر سانون کو پوچھنے آئے۔ دلو نے کہہ دیا کہ وہ کہیں چلا گیا۔ لیکن جیبھی حجام نے دیکھ لیا تھا کہ وہ اسی مکان میں آیا ہے اور ان دونوں نے اسے کمرے میں بند کر دیا ہے۔ جیبھی نے پیادوں کو بتا دیا تھا کہ ور پیادوں نے بات بات میں کہہ دیا کہ جیبھی سے معلوم ہو چکا ہے کہ وہ اسی مکان میں ہے۔ ایک دو نے یہ بھی کہا کہ وہ اسے پکڑ کر لے جائے بغیر نہیں رہیں گے۔

اب دلو کو تاب نہ رہی۔ اس کا چہرہ غصّے سے لال ہو گیا۔ ہونٹ کانپنے لگے۔ اس نے تن کر کہا:

"تم اسے نہیں لے جا سکتے۔ اگر تم زمین لال کرنا چاہتے ہو تو کنڈی کو ہاتھ لگاؤ۔"

پیادے آگے بڑھنا چاہتے تھے مگر پندرہ بیس آدمیوں کو دیکھ کر انکی ہمت نہ پڑی۔ ان میں سے ایک دو نے یہ بھی رائے دی کہ چل کر مالک سے سارا حال کہہ سُنانا چاہیے۔ بغیر حکم کے جھگڑا مول لینا ٹھیک نہیں۔

اس وقت سے شام تک ایک ہی خبر اُڑتی رہی۔ گماشتہ جی دوسری جگہوں سے آدمی بلوا رہے ہیں کہ گاؤں کو لوٹ لیا جائے۔ کھلیان پر قبضہ کر لیا جائے۔ اب کھلم کھلا لڑائی کا اعلان تھا۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے چپ تھے۔ اب کس کی طرف سے بولتے اور کس کو سمجھاتے —— اور

ان کو سنتا بھی کون تھا۔ ایک طرف تھا حکومت کا غرور اور دوسری طرف عزت کا احساس۔ ان دونوں میں سمجھوتے کی گنجائش کہاں ہے۔

بات بڑھی تو کام بھی بڑھ گیا۔ آس پاس کے سارے گاؤں میں سنسنی پھیل گئی۔ ہر گاؤں کے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ سب کے ساتھ ایک ہی جیسی بات تھی۔ ہر ایک کو ایک ہی قسم کی مصیبت کا سامنا تھا۔ اب سب کے سب ایک دوسرے کی مدد کرنے پر تیار تھے۔

زمیندار کے کارندے کسانوں سے زیادہ عقلمند ہوتے ہیں۔ ان کا کام ہی ہے کسانوں پر زمیندار کا رعب باقی رکھنا۔ ان کے لئے کام کرنا تحصیل وصول اور حکم نہ ماننے والوں کی سزا۔ سر اٹھانے والوں کا سر کچلنا۔ اسی لئے تو زمیندار انہیں رکھتا ہے۔ یہ لوگ سب کچھ جانتے ہیں کس وقت کام کرنا چاہیئے۔ فیل بان جانتا ہے کہ ہاتھی کس طرح قبضے میں رکھا جاتا ہے۔

پٹواری جی کچہری سے نکلے اور تھانہ پہنچے۔ ایک رپورٹ لکھوائی کہ گاؤں کے کسان کچہری کو لوٹنا اور کھلیان سے سارا غلہ اٹھا لینا چاہتے ہیں۔ گماشتہ جی گئے اور کالک کے کان بھرے اور بھڑکے ہوئے کسانوں کو راستے پر لانے کا سامان ہو گیا۔ یہ لوگ گاؤں میں چڑیوں کی طرح چیں چیں کرتے رہے۔

دو چار دن بھی نہ گزرے تھے کہ سانول دلوا اور بھاگو کے ساتھ کئی آدمیوں کو دفعہ ۱۴۴ کا نوٹس مل گیا۔ وہ نہ تو کھلیان کی طرف جا سکتے تھے اور نہ کچہری کی طرف ——— گاؤں میں ایک بڑی سبھا بھی ہوئی تو یہ لوگ میدان

میں نہ جا سکے۔ وہاں کھلیان تھا۔

سبھا ہونے کے بعد کچھ اور لوگ بھی سامنے آگئے اور ان پر بھی گر کڑی پڑنے لگی۔ لیکن آگ جو سلگی تھی وہ بجھی نہیں بڑھتی ہی گئی۔

سانول صبح سویرے اپنی ضرورت سے کھیتوں کی طرف جا رہا تھا۔ اسکے ایک ہاتھ میں پانی کا بھرا ہوا لوٹا تھا۔ سامنے جھبی آتا ہوا دکھائی پڑا۔ سانول ٹھہر گیا۔ جھبی جیسے ہی پاس آیا۔ سانول بولا:۔

"تم کو ہم سب سے بیر کاہے کا جھبی بھائی۔ تم کو سوچنا چاہئے کہ تم بھی کسان ہو"

جھبی بولا:۔

"تم لوگ تو جھوٹ موٹ بدنام کرتے ہو"

سانول کو اس کا یہ کہنا دھوکا نہیں دے سکتا تھا۔ وہ سب کچھ جانتا تھا۔ بولا۔

"دیکھو جھبی بھائی، یہ سب کہنے سے ہم نہ مانیں گے۔ یاد ہے تم کو اسی پٹواری نے تم کو مارا تھا۔ بات ذرا سی تھی نا۔ ایک دن بدن میں تیل ملنے نہ گئے تھے۔ — اپنی بے عزتی بھی بھول گئے؟"

جھبی کترا کر نکل جانا چاہتا تھا۔ بولا:۔

"بیکار باتیں کرنے کا کوئی فائدہ نہیں"

سانول نے کہا:۔

"یہی تو کہتا ہوں۔ ایسی بات کیوں کرتے ہو جس سے تمہارا کوئی فائدہ نہیں ہے"

لیکن سانول کو اس بات کو بھول گیا تھا کہ بھاگو کا باپ گاؤں کا بڑا اہل تھا اور اسی زمانے میں بہت سا کھیت جھبی سے لے کر زمیندار نے بھاگو کے باپ

کو دبا دیا تھا۔ اِس سے اُس کا دل اب تک صاف نہیں ہوا تھا۔ گو بات بہت
پرانی ہو چکی تھی۔ جیھبی نے کہا:۔
"سنو سانول! تم بیچ میں نہ پڑو۔ پھاگو کے باپ نے بڑا ظلم ڈھایا ہے ہم پر

....

"یہ بات بڑی پرانی ہو چکی، اسے بھول جاؤ۔ یا کہو تو پھاگو سے کہہ کر تمہارا
کھیت دلوا دوں   لیکن یہ تو سوچو کھیت تم سے باڑھو چاچا نے لیا نہیں۔
لیا تو تھا زمیندار ہی نے قصور کس کا ہے؟"
مگر جیھبی پر ان باتوں کا اثر کیا ہوتا۔ اس نے کہا:۔
"سانول میں تم سے بحث کرنے نہیں آیا ہوں ـــــــ"
"سب ٹھیک۔ پھر یہ تو بتاؤ، اس دن تم پیادے کیوں لائے تھے۔ ان کو
کیوں کر بتایا تھا کہ سانول پھاگو کے گھر پر ہے۔ میرے باپ نے تمہارا کھیت
نہیں لیا تھا۔"
جیھبی کھسیا گیا اور اس نے کہا:
"مجھے بحث کرنے کی فرصت نہیں۔"
وہ دو قدم آگے بڑھا، لیکن سانول نے اس کا راستہ روک لیا اور ذرا
تیکھا ہو کر بولا:۔
"سنو جیھبی بھائی۔ تمہیں جواب دینا ہو گا۔ کسی کی راہ میں کانٹے بچھانا
اچھا نہیں، یہ تمہارے حق میں بڑا برا ہو گا۔"
جیھبی جانتا تھا کہ سانول غصیل آدمی ہے، اس لئے وہ کسی طرح بات کا ٹھ کم

نکل جانا چاہتا تھا۔ وہ خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ پھاگو کے باپ پر جو الزام رکھ رہا ہے وہ بھی غلط تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ گاؤں میں کسی نے کچھ اس کا بگاڑا نہیں تھا اور وہ صرف اپنے فائدے کے لیے گاؤں بھر کے آدمیوں کو نقصان پہنچا رہا تھا اور پٹواری تک خبر پہنچانے کے بعد گاؤں کے سارے لوگوں سے الگ سا ہو گیا تھا۔ مگر اب بُرے کے پھندے پڑ گیا تھا۔ سانول کو جواب دیئے بغیر چلے جانا ممکن نہ تھا۔ اس نے کہا:۔

"سانول دیر ہو رہی ہے۔ ہمیں کام ہے، راستہ چھوڑ دو"

اگر کھلا ہوا راستہ ہوتا تو شاید جھبی کسی دوسری طرف سے چلا جاتا مگر راستہ کے لئے ایک ہی پگڈنڈی تھی اور اس کے دونوں طرف اوکھ کے گھنے کھیت تھے جن میں آدمی سے زیادہ اونچے اُوکھ لہلہا رہے تھے۔ راستہ بالکل نہ تھا۔ اس کے کہنے پر بھی سانول نے راستہ نہ دیا تو جھبی نے چاہا، اس کو ہٹا کر چلا جائے ـــــ لیکن سانول نے اس کا ہاتھ پکڑ کر۔ جھبی نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا اور بولا:۔

"لڑنا چاہتے ہو کیا؟"

سانول بولا:۔

"ہم لڑنا نہیں چاہتے، لیکن اس کی ضرورت پڑی تو باز بھی نہ آئیں گے۔ ہم تو تم سے یہی پوچھ رہے ہیں کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟"

جھبی کو غصہ آچکا تھا، اس نے کہا:

"کیا تو اس میں کسی کے باپ کا کیا ـــــ"

سانول کو ایسی باتوں کی تاب کہاں تھی۔ وہ دیر سے اپنے غصّے کو دبائے ہوئے تھا۔ گالی جھبیی کے منہ سے نکلی ہی تھی کہ پانی سے بھرے ہوئے لوٹا اس نے جھبیی کے سر پر دے مارا۔ جھبیی کے سر سے خون اور لوٹے سے پانی بہنے لگا اور وہ چکرا کر گر گیا۔

بات اور زیادہ بڑھ گئی۔ نتکانہ خود ہی پھنس گیا۔ پولس آئی اور سانول گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ گواہ کہاں سے آئے؟ مقدمہ میں دوسرے لوگ کیسے پھنسیں۔ مگر روپیہ ہو تو یہ مشکل نہیں۔ روپیہ خرچ کرنیوالا ہونا چاہئے۔ کام کون سا ہے جو نہیں ہوتا۔ روپیہ ہو تو ایشور بھی خوش ہو سکتا ہے۔ مندر اور دھرم سالے بنا کر۔ اور کسی کو پھنسا لینا کیا مشکل ہے۔ زمیندار نے فیصلہ کر لیا کہ چاہے گاؤں اُجڑ جائے لیکن سر اُٹھانے والوں کا سر کچلا ضرور جانا چاہئے۔

ایک طرف سانول کا مقدمہ کھلا، دوسری طرف دلو اور بھاگو اور دوسروں کے خلاف دھڑا دھڑ رپورٹیں ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ جب پورا اغلہ کھلیان میں آگیا تو ان سب پر، جن پر کسی طرح کا شک تھا دفعہ ۱۴۴ کے نوٹس کی تعمیل ہو گئی۔ سب کے سب ڈر سے کانپ رہے تھے۔ زمین اداری تھی زمیندار کی اور راج تھا پٹواری کا ــــــــ

آخر اس طرح کب تک چلتا لوگ اکتا گئے۔ غریبوں کے پاس اتنا روپیہ کہاں سے آئے جو مقدمہ لڑیں، اس لئے چُپ رہنا ہی بہتر۔ لیکن چُپ رہیں تو کب تک۔ دلو نے بھاگو کو ایک دن بلا کر کہا:

”اب کچھ کرنا چاہئے، اگر چُپ رہے تو مطلب یہ کہ پٹواری جی من مانی

کرتے جائیں گے۔ اب جو بھی ہو۔

بھاگو اور دوسرے لوگوں نے بھی رائے کا ساتھ دیا اور بات طے پائی کہ جب تک کھلیان اُٹھے دوسرے گاؤں میں جلسے کئے جائیں اور اس پر عمل بھی کیا گیا۔ جب آس پاس کے سارے گاؤں میں تحریک چل پڑی تو دوسرے لوگ بھی جن پر اس کا اثر پڑ سکتا تھا، سر جوڑ کر بیٹھے اور سر پر آنے والی آفت سے بچنے کے ترکیبیں سوچنے لگے۔

بات بڑھتی گئی اور اس کا اثر بھی بڑھتا گیا۔ دھنی رام بھی ایک کسان تھا جو ان لوگوں کے ساتھ پورے جوش سے کام کر رہا تھا۔ جب ساتوں کی ضمانت نہیں ہوئی تو وہ کچھ بول پڑا اور سب کے ساتھ بدمعاشوں کی فہرست میں اس کا نام بھی آگیا اور نشانہ بن گیا۔

ایک دن صبح ہونے سے پہلے ہی وہ کسی کام سے دوسرے گاؤں جا رہا تھا، بیچ میں راستہ تھا اور دونوں طرف اوکھ کا کھیت، ہر طرف سناٹا اور اندھیرا تھا۔ وہ بہت دور جا بھی نہ سکا کہ پیچھے سے کسی نے اس کے سر پر لاٹھی ماری۔ وہ گر پڑا۔ پھر ایک دو چار پانچ دس۔۔۔۔۔ وہ ادھ مرا ہو گیا۔ سارے گاؤں میں اس سے کھلبلی مچ گئی۔

پولس آئی اور بہت سے لوگ گرفتار ہوئے۔ گرفتار ہونے والوں میں دلو، بھاگو، جمن، ہرکھو سبھی تھے۔ یہ سب کے سب تھانے سدھارے۔ ان پر کھیت کاٹنے، کھلیان لوٹنے اور دھنی رام پر حملہ کرنے کا الزام تھا۔ سب کا جیل جانا یقینی، پٹواری خوش تھا۔ سارے بدمعاش پکڑے جا چکے تھے۔۔۔۔

وہ اپنی کامیابی پر خوش تھا لیکن آئندہ کیا ہوگا، یہ سوال لرزہ خیز طور پر اس کے دماغ میں پیدا ہو جایا کرتا تھا

کھلیان بھرتا جارہا تھا لیکن اب کھلیان میں کسانوں سے زیادہ پولس کے سپاہی نظر آرہے تھے۔۔ نہیں کھلیان کی حفاظت کرنی تھی۔ کسان سارے بے ایمان ہو چکے تھے اور اس کی سزا بھی پاچکے تھے مگر یہ بوڑھے اور بچے جو گاؤں میں بچ رہے تھے وہ بھی تو آخر کسان ہی تھے۔

پوس کا مہینہ تھا، کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی، کھلیان کی حفاظت کرنے والے سپاہی اپنے گرم کوٹوں کے باوجود ٹھنڈک سے سکڑے جاتے تھے۔ سب نے مل کر بڑا سا الاؤ جلایا۔ آگ تاپ رہے تھے اور کہانیاں کہی جارہی تھیں۔ الاؤ بجھنے لگا، ایک سپاہی اُٹھتے ہوئے بولا:۔

"ایک دن ساری چیزیں اسی طرح ختم ہو جائیں گی"

دوسرا بولا:۔

"سالے پٹواری کا کچھ۔ وہ لائن میں کیسے آرام سے رہتے ہیں اس وقت"

اس کے اُٹھتے ہی دوسرے سپاہی بھی اٹھ کر جھونپڑے میں چلے گئے اور الاؤ بجھ گیا۔ کھلیان میں سپاہیوں کا شور گاؤں کے سناٹے میں مل گیا

آنکھ مچولی

وہ بچپن ہی سے بہت شوخ و چنچل اور بڑی ہنس مکھ تھی، دیکھنے والے
اسے دیکھ کر کہتے "ہنستے ہی ہنستے تو گھر بستے ہیں" اور جب اس کی زندگی کا دوسرا-
اور سب سے اہم دور شروع ہوا تو اس کے تبسم اور زیادہ رنگین ہو گئے اور ہنسی
کی سُریلی جھنکاریں ستاروں کی طرح تابناک ہو گئیں۔ اسے تنہائی سے وحشت
ہوتی۔ اسی لئے وہ رنگ و بو کی طرح ہر محفل پر چھائی رہتی۔ اس سجی سجائی کوٹھی
سے ہر گھڑی قہقہے بلند ہوتے رہتے تھے۔ اور احاطے میں سائیکلوں کی قطاریں
لگ جاتیں۔ لیکن وقت اور بے وقت بھرے بھرے رکشوں اور آتے ہوئے
موٹروں سے وہ اُکتا گئی تھی۔ ایک ہی طرح کے ہنگاموں سے اب اس کا جی گھبرا
گیا تھا۔ دن اور رات کے اکثر حصوں میں لوگوں کی طرح طرح کی ٹولیاں اس کے
یہاں آتیں۔ کچھ اس کے بھائی کے دوست آتے جن کے آتے ہی ڈرائینگ روم
کے پردے کھنچ جاتے۔ برج کا دور چلنے لگتا۔ مونوپلی اور کیرم کے کھیل کھیلے
جاتے۔ پھر اس کے دیور اور دوسرے بھائی کے ساتھی آتے۔ موٹی موٹی لال
پیلی جلدوں کی کتابیں دبائے، کبھی تو ان کے آتے ہی کمرے بند ہو کر پڑھائی

شروع ہو جاتی اور کبھی وہ بلّے اور گیندلے ٹینس لان پر اُچکنے لگتے۔ ادھر
روز شام ہوتے ہی گیارہ گیارہ بجے رات تک اس کے شوہر فیض کے ملنے
والے آئے رہتے۔ ڈرائینگ روم برآمدہ اور کبھی کبھی سامنے کا احاطہ کرسیوں
سے بھر جاتا۔ پھر تو شاعری اور فن شاعری کے جام چھلکتے اور ادب کی باریکیاں
بیان ہوتیں۔ فیض کا ذوق ادب بہت بلند اور اس کا مشاہدہ بہت گہرا تھا۔
وہ ایک کامیاب ادیب تھا جس کے افسانے، ڈرامے، تنقید اور نظموں میں
زندگی کی جاگتی ہوئی لہریں رواں اور دواں رہتی تھیں۔ کبھی زندگی کے اہم
اصول اور دُنیا کے نظام پر نگاہ دوڑائی جاتیں، گہرے اور دقیق مسئلوں
اور ان کی باریکیوں پر تبصرے ہوتے، قہقہے گونجتے، ہنسی کی لہریں اُٹھتیں۔
اس کی کوٹھی میں زندگی لہراتی رہتی مگر یہ سب ہوتے ہوئے بھی وہ گھر کے
اندر اپنے کو بے تھاہ وسیع خلا میں تنہا محسوس کرتی۔ ایک عرصہ تک انہی قہقہوں
اور ہنسی کی انہی موجوں میں اپنے کو فریب دیتی رہی تھی، دیر دیر تک پردے
نیچے کمرے کے دریچے پر بیٹھی اُن کی باتیں سُنتی، اُن کے تماشے دیکھتی۔ اور
بیل کے شربت، انڈے کے حلوے، ناشتے اور چائے سے ان کی خاطریں کرتی
رہتی تھی۔ پس پردہ اس نے اپنی رنگینیوں میں اپنے آپ کو بہلانا چاہا تھا، مگر اب سے
اس گھر سے وحشت ہونے لگی تھی۔ یہ اس کا گھر نہیں تھا۔ زندگی کی ہر شاہراہ پر
ایک پر رونق کلب تھا اور اس کا جی چاہتا تھا اس کا اپنا کوئی گھر ہوتا۔
بارہ سال کا ایک طویل عرصہ وہ اس کلب میں گزار کر اب تھک گئی، تاش کے
پتے، کیرم کی کھٹا کھٹ اور مونو پلی کی ہار جیت میں وہ اپنی زندگی کی شکست ہی

شکست دیکھ رہی تھی۔ بلّے اور گیند کی ہر ایک ضرب نے اس کے دل کو مجروح کر دیا تھا۔ اور ادب، دنیا، اور نظام حیات کے گہرے گہرے تبصروں نے اس کی زندگی کے ہر تار و پود کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بکھیر دیا تھا۔ گھر میں اتنے ہنگاموں کے ہوتے ہوئے بھی وہ خود ایک اُجاڑ ویرانہ میں ایک اکیلی ٹھنٹھ درخت تھی، اور ڈرائینگ روم کی حسین آرائش سے وہ اُکتا گئی تھی۔ اپنی تنہائیوں سے پریشان ہو کر وہ دن بھر میں کتنی کتنی دفعہ اپنے ہاتھوں سے گھر کی ایک ایک چیز جھاڑتی رہتی تھی مگر ان ساری چیزوں سے اب اس کا دل بھر گیا تھا۔ ایک مدّت سے ان لٹکتی ہوئی تصویروں کو دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ آتش دان پر رکھے ہوئے خوبصورت کھلونوں پر مہین مہین گرد دیکھ کر بھی اب وہ بے پرواہ رہتی۔ کارنس پر سجائی ہوئی گڑیاں بارہ سال سے بس ایک ہی طرح سے بے حس پڑی تھیں۔ رنگ برنگ کی چیکڑے اور مٹی کی گڑیاں۔ جنکے کپڑے ململ کی طرح گل کر اب پھٹتے جا رہے تھے اور ان کے چہرے پر جگہ جگہ سے خراشیں پڑ گئی تھیں۔ مگر وہ بے حس و حرکت تھکے ہوئے انداز میں بارہ سال کی طویل مدّت سے مسکرائے جا رہی تھیں۔ اسکو محسوس ہوتا جیسے وہ خود بھی مٹی یا چیکڑے کی ایک بے جان گڑیا ہے۔ اس پر بھی ایک جگ بیت گیا تھا اور وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی سرک نہ سکی تھی۔ اس کی روح کی دھجیاں بھی تار تار ہو چکی تھیں، اور مٹی کی گڑیوں کے چہرے سے کہیں زیادہ .... کھرچنیں اس کے دل پر پڑ گئی تھیں۔ انہی کی طرح اس کے لبوں پر بھی مسکراہٹ پھیل جاتی تھی۔ وہی مُردنی سی بے حس

مسکراہٹ، اب تک وہ انجان طور پر ایک بچہ کی طرح ان کھلونوں سے کھیلتی رہی تھی، نقلی کھلونوں، اور مٹی کی بے جان گڑیوں سے۔ مگر یک بیک اتنے دنوں کے بعد اب اس کا جی بے اختیار چاہنے لگا تھا کہ کمرے کے ان ریشمی پردوں سے لپٹ لپٹ کر کوئی جھولتا رہے۔ اس کی روح کو ایک طوفان کا انتظار تھا اور وہ اس آندھی میں گھر کی ایک ایک چیز کو تتر بتر دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کا جی چاہتا کہ کوئی لمبا بانس لئے ان چمکتی ہوئی ساری نفیس تصویروں کو گرا کر چکنا چور کر دے اور اس کا منہ چڑاتی ان مسکراتی ہوئی بے حس گڑیوں کو توڑ توڑ کر کوئی اس کی نگاہوں سے انہیں دور کر دیتا۔ وہ چاہتی تھی کہ میز اور کرسیاں اوندھی رہتیں اور سنگاردان کے شیشے پر بڑے بڑے دھبے پڑے رہتے۔ اس صاف ستھری اور جھلملاتی ہوئی کوٹھی سے اب اس کا جی اکتا گیا تھا۔ وہ کوئی تبدیلی چاہتی تھی۔ ایسی اہم تبدیلی جو گھر کے کونے کونے پر چھا جائے۔ لمبے بانسوں میں ریڈیو کے ایریل دیکھتے ہی بیتابانہ اس کا دل چاہتا کہ گھر کے ایک ایک تختے میں وہ رسّی کی بھدّی بھدّی الگنی ٹانگ کر ان پر ننھے ننھے بے شمار کپڑے پھیلا دے۔ عجیب عجیب طرح سے بے ہنگم کپڑے جو کبھی اس گھر میں استعمال نہ ہوئے تھے۔ سب سے زیادہ اس کو اپنی بے کاری کھلتی رہتی۔ سارا کا سارا دن پڑا رہتا۔ وہ کتابیں پڑھتے پڑھتے تھک جاتی ایک ہی طرح سے آخر وہ کتنی دیر وہ لکھتی رہتی۔ لکھی ہوئی سطریں جب اسکی نگاہوں کے سامنے ناچنے لگتیں تب وہ اکیلی اٹھ کر کوٹھی میں بے مقصد چکر لگاتی، باورچی خانہ کے در پر کھڑی نوکروں کی باتیں سنتی، ڈاکیہ کی آواز سنتے ہی

وہ خود ڈاک لینے چلی جاتی۔ ترکاری، دال، دھوبن اور دودھ والیوں سے وہ خواہ مخواہ کی مہمل باتیں دیر دیر تک کرتی رہتی۔ ایسا کرتے ہوئے اس کی خودداری کو ٹھیس لگتی اور وہ تلملا کر رہ جاتی۔ ایسی باتیں اس کی شان کے خلاف تھیں۔ پھر وہ کیا کرتی، کچھ وقت تو جیسے تیسے کر کے گزر جاتا تھا، مگر آخر کب تک ایک ہی شاہراہ پر کھڑی وہ اپنے کو فریب دے سکتی تھی ——!

اس کی کوٹھی سے لگی ہوئی دوسری کوٹھی میں گھوش بابو تھے۔ خوبصورت نازک سے، خوش نظر اور خوش سلیقہ، ان کی کوٹھی اور احاطے کا ہر ہر کونا گلزار جنت بنا رہتا۔ انہیں پھولوں سے فطری طور پر ایک مجنونانہ عشق تھا۔ وہ خود بھی اسی شاخ کے ایک شگفتہ پھول نظر آتے اور ان کی بیوی اس گلدستے کے سارے پھولوں میں سب سے زیادہ نمایاں اور حسین پھول تھیں۔ وہ سچ مچ میں ایک گلدستہ جیسے لگتے، شگفتہ، خوبصورت رنگین اور خاموش —— ایک گہرا سکون ان کی کوٹھی پر ہر وقت چھایا رہتا۔ مگر جب سے ننھا گلاب ان کے درمیان آگیا تھا تب سے ان کے گھر میں زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ دُبلا پتلا حسین سا بچہ جب غوں غاں کے بعد اپنے کمرے کے دریچہ پر کھڑا ہو کر "ماں، ماں" کہہ کر شور مچانے لگا تو ایک دن پروین اپنے دریچہ سے پکار کر بولی "گلاب! ماں نہیں امی بولو امی ——" اور یہ اس کا گلاب نام بھی اسی نے رکھا تھا۔ ننھی ننھی انگلیوں سے دریچہ کے جنگلے کو پکڑے۔ دو ایک روز تک تو چپ چاپ سے وہ پروین کی امی امی کہتی ہوئی آواز کو سنتا رہا اس کے بعد سے دریچہ کے سفید پردے کے اوپر سے اُچک اُچک کر چیخنے لگا

——— "امی! امی!" پہلے تو پروین نے سمجھا کہ گلاب اپنا سبق یاد کر رہا ہے مگر جس دن اُس نے یہ محسوس کیا کہ سارا سارا دن اور کبھی رات کو بھی امّی امّی کہہ کر وہ خود اسے پکارنے لگا ہے تو ایک عجیب سی تڑپ اس کے دل میں پیدا ہوئی۔" امی۔ امی"۔ یہی پیاری سی آواز سُننے کی وہ کتنے دنوں سے منتظر تھی۔ اس سے پہلے بھی کئی دفعہ اس کی روح میں پر خلش انگڑائیاں آچکی تھیں مگر اس آواز نے اسے ہولناک طور پر بیدار کر دیا تھا۔ یاقوت کی طرح سُرخ لب اور بھٹی بھٹی سیاہ آنکھوں والا حسین سا بچہ جب اس سے لپٹ لپٹ کر کہتا "امی" تو وہ اکیلے میں اس کے سفید گالوں پہ اپنے بھیگے ہوئے رخسار رکھ کر کہتی۔" میرا گلاب۔ میرا گلاب" وہ سارے گھر میں ایک بیتری کی طرح دوڑتا رہتا۔ اور جب گھوش بابو کی بیوی گلاب کو پروین کے پاس رکھ کر گھوش بابو کے ساتھ کسی اچھی سی انگریزی فلم دیکھنے چلی جاتیں تو پروین تھوڑی دیر کے لئے یہ بھول جاتی تھیں کہ گلاب کس کا بچہ تھا ———! امی گلاب اور گلاب کی مسلسل پکاروں نے اس کی رُوح میں ایک خلفشار مچا دیا تھا ———!

یکا یک بارہ سال کی طویل مدّت کے بعد پروین نے اپنے میں ایک مبہم سی تبدیلی محسوس کی اور یکایک اس کا دل نئی نئی کیفیتوں سے ہم آہنگ ہونے لگا، رستے ہوئے جذبات نے ایک دھارے کی اس اس کی رگ رگ میں ہل چل مچادی تھی۔ اور وہ اپنے خواب و خیال کے حسین تصورات میں کھوئی ہوئی سی رہنے لگی

——— "امّی۔ امّی" کہتا ہوا گلاب جب اس کی گود میں آنے مچلنے لگتا تو وہ

آہستہ سے تھپتھپا کر بہلا دیتی "——— گلاب! تم گلاب ہونا؟ اور تمہیں ایک ننھا چمیلی کا پھول دوں گی لوگے نا؟" ——— پھر اس کی نگاہیں چمیلی کے اس حسین سے پھول کے تصور پہ جم جاتیں۔ نازک، خوبصورت ننھا سا چہرہ بڑی بڑی معصوم سی آنکھیں، سر پر امی کی طرح گھنگریالے بال، چھوٹی چھوٹی انگلیوں والا مہندی لگا ہوا سا پاؤں کبھی ہنستا کبھی بلکتا ہوا پھول کی پنکھڑیوں جیسا یاقوتی ہونٹ" ——— یہ سب کیا ہو رہا تھا، کیسے ہو رہا تھا، وہ ایک آرٹ کی تخلیق کر رہی تھی۔ اور اسے خود ہی معلوم نہیں تھا کہ وہ کیسا شاہکار بنا رہی ہے۔

فیض نے جب یہ خبر سُنی، مسرت سے وہ جھوم گیا۔ پھر اس کی بڑی بڑی خاطریں ہونے لگیں۔ اس کے سونے کے کمرے میں سُرخ سُرخ شاداب امریکن سیب خوش رنگ نازنگیاں اور بلور کے طرح چمکتے ہوئے دانوں والے انگور کے خوشے رکھے جانے لگے۔ فیض حُسن کا پرستار اور شعر و ادب کا ایک کامیاب آرٹسٹ تھا، اسی لئے وہ چاہتا تھا کہ نیند سے بیدار ہوتی ہوئی پروین کی نگاہ کا پہلا ٹھہراؤ حسین اور لطیف ہو اور انہی رنگینیوں اور شادابیوں کی آمیزش وہ پروین کے آرٹ میں دیکھنا چاہتا تھا ———!

پروین اپنے دل و دماغ پر چھائے کیف و سرور سے گھبرا کر کبھی کبھی سوچتی کہ دنیا کی اس پُرانی روایت کو وہ اتنی اہمیت کیوں دے رہی ہے۔ ایک ایک گلی میں کتنے کتنے بچّے پڑے ہوئے تھے پیسے میں دو دو ملنے والی گڑ کی مٹھائی اور رینگتے بلبلاتے ہوئے بچّوں کی اس دُنیا میں کوئی کمی نہ تھی۔ اور ایک ہی وقت میں ان دونوں پر کتنی مکھیاں بھنکتی رہتی تھیں۔ شاید خود غرضی ہی انتظار

طویل ہو کر اپنی قدر کرانے لگتا ہے۔ اور اگر یہ بارہ سال کا یہ جگ نہ بیت جاتا تو چمیلی کا نازک سا پھول اس کے لئے اتنا خوشبو دار نہ ہوتا۔ اسی لئے بے چارہ گلاب چھوٹے چھوٹے سے قصور پر بھی اکثر پٹ جایا کرتا تھا۔ پھول کی ایک کلی اور ایک کالے سے بیگن توڑ لینے کے جرم میں گھوش بابو نے اسے کئی دفعہ مارا تھا۔ گلاب کے تھے صرف پروین کی ایک اکیلی گود ہی پرسکون تھی وہ اپنی سزاؤں کا اتنا عادی ہو گیا تھا کہ کسی قصور پر بلا کہے سنے بھی اپنے ہاتھوں سے دونوں کان پکڑے وہ اپنے مخصوص کونہ میں کھڑا ہو جاتا۔ مگر جب اسکو اکیلے کمرے میں بند ہونے کی سزا دی جاتی تو وہ دریچے پر چڑھ کر زور زور سے پکارتا ——— "امی! امی!" اور پروین اپنے سارے کام کو چھوڑ کر اپنے کمرے کے دریچے سے لگ کر گلاب کے سامنے کھڑی ہو جاتی ——— پھر گلاب اپنی زبان میں شکایت شروع کر دیتا ——— "امی! امی! ہم کو مان۔ بن بن" یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی پروین کو ایک لطیف انتظار تھا۔ وہ لیٹی لیٹی سوچتی رہتی اور بہت سے خوبصورت نازک نازک سے بچے اس کے پاس چکر لگاتے۔ کبھی نزدیک اور کبھی اس سے بہت دور۔ اُس کے گرد منڈلاتے ہوئے ننھے ننھے سے کلبلاتے ہوئے بچے۔ کبھی کبھی اس کی روح سرگوشیاں کرتے "چناپنی پھو" اسے ٹیگور کی کہانی یاد آکر دکھلا دیتی پھر اسے لگتا جیسے بارہ سال سے چھپے ہوئے اس کے بہت سے پھول جیسے بچے آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے اب اس سے بہت قریب آرہے تھے۔ "امی تا!" ———!! اسے گھر کے کونے کونے سے یہی آواز آتی ہوئی محسوس ہوئی ——— "امی تا" ——— امی تا" ———

لیکن اس آواز کے ساتھ اس کو افسانہ کی وہ بچی یاد آجاتی جسے تابو لانہ آتا تھا اور وہ الماری، شلف اور کواڑوں کے پیچھے چھپ چھپ کر اپنی ماں سے بس یہی ایک کھیل کھیلا کرتی "امی چیکو" ——— "امی چیکو" اور اس کی ماں جان بوجھ کر اسے ڈھونڈتی پھرتی، مگر اس بچی کی آیا اس منحوس کھیل کھیلنے سے ان کو اکثر منع کرتی تھی اور آخر ایک دن بخار میں سر کو دُھنتی "امی چیکو" "امی چیکو" کہتی ہوئی وہ بچی اپنی ماں کی ڈھونڈتی ہوئی نگاہوں سے ہمیشہ کے لئے چھپ گئی تھی۔ اور اب یہی تکلیف وہ آواز پروین کو سُنائی دے رہی تھی۔ سارے لوگ خوش تھے۔ زندگی کی ایک مچلتی ہوئی لہر گھر بھر میں دوڑ گئی تھی ——— وہ کمزور ہوتی جارہی تھی لیکن نقاہت کے اس پردے میں اس کی بیتابیاں منہ زیں چھپی ہوئی تھیں۔ ڈوبتے ہوئے آفتاب کی کرنوں کی طرح اس کا چہرہ زرد ہوتا جارہا تھا۔ فیض نے بار بار اسے ڈاکٹر کو دکھانا چاہا مگر پروین کو ڈاکٹر کے نام سے وحشت ہونے لگتی۔ ایک مبہم سا خوف اس کے جسم کو کپکپا دیتا۔ شاید۔ شاید یہ اس کی روح کا ایک فریب ہو۔ اور اگر یہ صرف ایک خواب تھا تو وہ اسے ہمیشہ اپنی آنکھیں بند کئے دیکھتی رہنے کی آرزو مند تھی ——— اس کی مسہری کے چاروں طرف دیوار میں خوبصورت سے فریم میں کئی تصویریں فیض نے لاکر اپنے ہاتھوں سے لگائی تھیں ——— کسی کے بال گھنگریالے تھے، کوئی پھولے پھولے گالوں والا بچہ منہ پھاڑے ہوئے ہنس رہا تھا۔ اور کسی کا مسکراتا ہوا پیارا سا چہرہ کوئی ہمک ہمک کر اس کی گود میں آنے کو مچل رہا تھا اور کسی طرف سے بلکتا ہوا بچہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اسے بُلا رہا تھا۔ پروین کو

ان تصویروں سے شدید طور پر محبت ہو گئی تھی۔ یہ سارے بچے اسی کے تھے۔
صرف اسی کے بارہ سال سے چھپے ہوئے یہ ہنستے، بلکتے اور ہمکتے ہوئے اتنے
سارے بچے ایک ہی دفعہ اس کی خالی گود میں آنے کو مچل رہے تھے، پروین
انہیں دیکھ کر کبھی کبھی تڑپ سی جاتی۔ وہ ان کے نزدیک جاتی پھولے پھولے
گالوں اور ہلاتی ہوئی ننھی ننھی انگلیوں کو دیوانہ وار چوم چوم کر کہتی "میرے
بچے میرے لال میں کیسے تمہیں اپنے کلیجے میں بٹھالوں" —— سجے ہوئے
کمروں کو دیکھتی ہوئی وہ انتقام سوچتی —— تمہاری سپیدیاں میرے دل
پر چرکے لگاتی رہی ہیں، اب یہاں ہر ہر جگہ دھبے نظر آئیں گے۔ دودھ کی
شیشی رہے گی۔ ہورلکس کی بوتلیں رہیں گی اور دہکتی ہوئی انگیٹھی اور ہر طرف
اس کی راکھ بکھری پڑی رہے گی وہ اس کوٹھی کا منہ چڑا چڑا کر بہت سی الگنی
تانگے گی اور ان کرسیوں پر بھی بہت سے بے ہنگم سے کپڑے پھیلے رہیں گے۔
اس گھر کی ترتیب وار ساتگی سے وہ تھک گئی تھی۔ اس لئے ہر ہر طریقے
سے وہ اپنی روح کی اس بیزاری کا اعلان کرے گی —— گلاب بہت زیادہ
نزدیک رہ کر اب اس سے دور ہوتا جارہا تھا۔ پروین کی نگاہیں پھولوں
کے حسین ڈھیر میں اپنے لئے ایک انوکھے پھول کا انتخاب کر رہی تھیں۔ مگر اس کا
وہ لہکتا ہوا پھول اس کے تخیل سے بھی بہت بلند تھا۔ اکیلے بیٹھے بیٹھے بہت سے
خیالات اس کے دماغ میں چکر لگاتے رہتے کبھی تصویر میں چمیلی کی نازک پنکھڑیوں
کی طرح ننھے ننھے سے ہاتھوں کو بیتابانہ چومنے لگتی اور کوئی "امی! امی" کہتا
ہوا اس کا کلیجہ سے لپٹ جاتا مگر کبھی پاس کے مہیب ناک جھونے میں اس کا مضطر

دھڑکتا ہوا دل جھولنے لگتا "ہاں" "نہیں"۔۔۔ جھولے کی پرانی رسی ہر ایک پینگ لینے پر چچا رہی تھی اور پروین یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ "ہاں اور نہیں" کے کس کنارے پر گرے گی۔ کاش یہ چچیاتی ہوئی رسی کبھی نہ ٹوٹے اور وہ "نہیں" سے گذرتی ہوئی بھی "ہاں" کے وقتی کناروں سے ٹکرا کر جھولتی رہے۔

گلاب کی ایک ٹوٹی ہوئی ننھی ننھی سی کلی گھوش بابو نے گلاب کے ہاتھ میں دیکھی۔ باپ کی نگاہوں کو پہچان کر گلاب سہم گیا۔ گھوش بابو اپنا غصہ برداشت نہ کر سکے، وہ زور سے چلائے! "نکلو یہاں سے، نکلو یہاں سے" گلاب اپنی آنسوؤں سے بھری ہوئی حسین آنکھوں کو اپنی ننھی ننھی انگلیوں سے ملتا ہوا اپنے گھر کے پھاٹک سے باہر نکل آیا اور روتا ہوا گلاب دوسرے پھاٹک سے ہو کر سیدھا پروین کے پاس چلا آیا اور اس کی گود میں منہ چھپا کر سسک سسک کر رونے لگا۔ پروین کی آنکھیں بھی پرنم ہو گئیں اور وہ فطرت کی اس غلط تقسیم کو اپنے سینے سے لگائے اسے زور زور سے بھینچ کر پیار کر رہی تھی۔ گلاب، پھر اپنے کھیل میں لگ گیا وہ کمرے میں دوڑ دوڑ کر چوں چوں کر کے پھدکتی ہوئی گوریا کو پکڑنے لگا۔ اس گوریا کی دُم پکڑنی ہی چاہی تھی کہ اس کے ہاتھ کی ٹھوکر سے میز پر رکھا ہوا گلاس نیچے سے گر کر چور چور ہو گیا۔ گلاب اپنی جگہ پر سہم۔ یک بیک اس کے ننھے ننھے ہاتھ اوپر اٹھے اور وہ اپنے کان کو پکڑے کونے میں کھڑا ہونے کو جا رہا تھا کہ پروین دوڑتی ہوئی آ کر اس سے لپٹ گئی اور بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا "میرا بچہ! میرا لال!" پروین کو تو یہ "چھن" کی آواز بڑی اچھی لگی تھی اور کاش وہ اس پیاری سی آواز کو ہر روز سنتی رہتی۔ گلاب کے لئے اس کے

قصور پر پروین کا اتنا بیتابانہ پیار ایک نئی چیز تھی۔ وہ اسے حیرت سے تکتا ہوا اپنا سفید سفید ہاتھ پروین کے گلے میں ڈال کر محبت بھری خوشامد سے کہنے لگا:۔ "امی! امی!"

پروین کی صحت کی کمزوری سے گھبرا کر آخر فیض نے لیڈی ڈاکٹر کو بلا ہی لیا۔ ذبح ہوتا ہوا بکرا جس طرح قصائی کی چمکتی ہوئی چھری کو دیکھ کر لرز جاتا ہے، اسی طرح پروین لیڈی ڈاکٹر کو دیکھ کر کانپ گئی۔ اُمیدوں کے جھولے میں زور زور سے پینگیں پڑنے لگیں اور جھولے کی وہ پُرانی چمچاتی ہوئی رسّی اس کے سامنے ٹوٹتی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ "ہاں۔" "نہیں" دونوں کناروں سے اس کی روح زور زور سے ٹکر کھا رہی تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں کو بند کر لیا کہ وہ اپنا آخری انجام نہ دیکھ سکے جھولے کی رسّی ٹوٹ رہی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ لیڈی ڈاکٹر نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ اس کی روح میں ایک زبردست دھماکہ ہوا اس کو لگا جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرے چھا گئے ہیں۔ کوٹھی کے سفید چونے اور کمروں کی سجاوٹیں اس طوفان میں بجلی کی طرح رہ رہ کے چمک رہی تھیں۔ ہنسی، بلکتی اور مہکتی ہوئی تصویریں گہری تاریکیوں میں چھپتی جا رہی تھیں۔ ایسے اندھیرے اور ایسی آندھی میں اس کے کانوں میں ایک آواز آئی "امی تا" اور اس کی دیوانہ وار روح بیتابانہ طور پر دوڑتی ہوئی اسے پکڑنا چاہ رہی تھی مگر اس بڑھتے ہوئے طوفان میں آواز کا فاصلہ دور ہٹتا جا رہا تھا "امی تا" "امی تا" اور پھر ہولناک اندھیرے

میں یہ آواز ہلکی ہوتی ہوئی ڈوب کر رہ گئی ——— ! فطرت اتنے دنوں تک پروین سے ایک ہولناک آنکھ مچولی کھیلتی رہی تھی اور پروین کے بے بس ہاتھ "امی تا" کی اس آواز کو نہ پکڑ سکے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں تکیہ سے لپٹی ہوئی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی "میرے بچے، میرے لال"

بابا نور

"کہاں چلے بابا نور؟" ایک بچّے نے پوچھا۔

"بس بھئی یہیں ذرا ڈاک خانے تک۔" بابا نور بڑا ذمہ دارانہ سنجیدگی سے جواب دے کر آگے نکل گیا۔

اور سب بچّے کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

صرف مولوی قدرت اللہ چپ چاپ کھڑا بابا نور کو دیکھتا رہا۔ پھر وہ بولا "ہنسو نہیں بچّو۔ ایسی باتوں پر ہنسا نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات بے پرواہ ہے۔"

بچّے خاموش ہو گئے۔ اور جب مولوی قدرت اللہ چلا گیا تو ایک بار پھر سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

بابا نور نے مسجد کی محراب کے پاس رُک کر جوتا اتارا، ننگے پاؤں آگے بڑھ کر محراب پر دونوں ہاتھ رکھے، اسے ہونٹوں سے چوما، پھر اسے باری باری دونوں آنکھوں سے لگایا۔ اُلٹے قدموں واپس ہو کر جوتے پہنے اور جانے لگا۔

بچے یوں ادھر اُدھر کی گلیوں میں گھسکنے لگے جیسے ایک دوسرے سے شرما رہے ہیں۔

بابا نور کا سارا لباس دھلے ہوئے سفید کھدر کا تھا۔ سر پر کھدر کی ٹوپی تھی جو سر کے بالوں کی سفیدی کی وجہ سے گردن تک چڑھی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی سفید داڑھی کے بال تازہ تازہ کنگھی کی وجہ سے خاص ترتیب سے اس کے سینے پر پھیلے ہوئے تھے۔ گورے رنگ میں زردی نمایاں تھی۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں کی پتلیاں اتنی سیاہ تھیں کہ بالکل مصنوعی معلوم ہوتی تھیں۔ لباس، بالوں اور جلد کی اتنی بہت سی سفیدی میں یہ دو کالے بھورے نقطے بہت اجنبی سے لگتے تھے۔ لیکن یہی اجنبیت بابا نور کے چہرے پر بچپنے کی سی کیفیت طاری رکھتی تھی۔ بابا نور کے کندھے پر سفید کھدر کا ایک رومال تھا جو لوگوں کے ہجوم سے لے کر مسجد کی محراب تک تین چار بار کندھا بدل چکا تھا۔

"ڈاک خانے چلے بابا نور؟" دوکان کے دروازے پر کھڑے ہوئے ایک نوجوان نے پوچھا۔

"ہاں بیٹا۔ جیتے رہو۔" بابا نور نے جواب دیا۔

پاس ہی ایک بچہ کھڑا تھا۔ تڑاک سے تالی بجا کر چلایا۔ "آہا۔ بابا نور ڈاک خانے چلا۔"

"بھاگ جا یہاں سے۔" نوجوان نے بچے کو گھُرکا۔

اور بابا نور، جو کچھ دور گیا تھا پلٹ کر بولا "ڈانٹتے کیوں ہو بچے کو۔

ٹھیک ہی تو کہتا ہے۔ ڈاک خانے ہی تو جا رہا ہوں۔"

دور دور سے دوڑ دوڑ کر آتے ہوئے بچے یہاں سے وہاں تک بے اختیار ہنسنے لگے اور بابا نور کے پیچھے ایک جلوس مرتب ہونے لگا۔ مگر آس پاس سے کچھ نوجوان لپک کر آئے اور بچوں کو گلیوں میں بکھیر دیا۔

بابا نور اب گاؤں سے نکل کر کھیتوں میں پہنچ گیا تھا۔ پگڈنڈی مینڈ مینڈ جاتی ہوئی اچانک ہرے بھرے کھیتوں میں اتر جاتی تھی تو بابا نور کی رفتار میں بہت کمی آجاتی۔ وہ گندم کے نازک پودوں سے پاؤں، ہاتھ اور ہولے کے دامن بچاتا ہوا چلتا۔ اگر کسی مسافر کی بے احتیاطی سے کوئی پودا پگڈنڈی کے آر پار لیٹا ہوا ملتا تو بابا نور اسے اٹھا کر دوسرے پودوں کے سینے سے لپٹا دیتا۔ اور جس جگہ سے پودے نے خم کھایا تھا۔ اسے یوں چھوتا جیسے زخم سہلا رہا ہے۔ پھر وہ کھیت کی مینڈ پر پہنچ کر تیز تیز چلنے لگتا۔

چار کسان پگڈنڈی پر بیٹھے حقے کے کش لگا رہے تھے۔ ایک کسان کی گندم کے پودوں کے درمیان سے کچھ اس صفائی کے ساتھ درانتی سے گھاس کاٹتی پھر رہی تھی کہ مجال ہے جو گندم کے کسی پودے پر خراش آجائے بابا نور ذرا سا رک کر لڑکی کو دیکھنے لگا۔ وہ گھاس کی دستی کاٹ کر ہاتھ کو پیچھے لے جاتی اور گھاس کو پیٹھ پر لٹکتی ہوئی گٹھری میں ڈال کر پھر درانتی چلانے لگتی۔

"بھئی کمال ہے۔" بابا نور نے دور ہی سے کسانوں کو مخاطب کیا۔ "یہ لڑکی تو بالکل مداری ہے۔ اتنی لمبی درانتی چلا رہی ہے۔ چپے چپے پر گندم

کا پودا اگ رہا ہے۔ پر درانتی گھاس کاٹ لیتی ہے۔ اور گندم کو چھوتی تک نہیں۔ یہ کس کی بیٹی ہے؟"

"تو کس کی بیٹی ہے بیٹا؟" بابا نور نے لڑکی سے پوچھا۔

لڑکی نے پلٹ کر دیکھا تو ایک کسان کی آواز آئی۔ "میری ہے بابا۔"

"تیری ہے؟" بابا نور کسانوں کی طرف جانے لگا۔ "بڑی سیانی ہے، بڑی اچھی کسان ہے، خدا حیاتی لمبی کرے۔"

"آج کہاں چلے بابا نور؟" لڑکی کے باپ نے پوچھا۔

"ڈاک خانے!" دوسرے نے پوچھا۔

"ہاں!" بابا نور ان کے پاس ذرا سا رک کر بولا۔ "میں نے کہا پوچھ آؤں شاید کوئی چٹھی وٹھی آئی ہو۔"

چاروں کسان خاموش ہو گئے۔ انہوں نے ایک طرف ہٹ کر پگڈنڈی چھوڑ دی اور بابا نور آگے بڑھ گیا۔ ابھی وہ کھیت کے پرلے سرے پر پہنچا تھا کہ لڑکی کی آواز آئی۔ "لسی پیو گے بابا نور؟"

بابا نور نے مڑ کر دیکھا اور گاؤں سے نکلنے کے بعد پہلی بار مسکرایا۔

"پی لوں گا بیٹا۔" پھر ذرا سا رک کر بولا۔ "پر دیکھ ذرا جلدی سے لا دے۔ ڈاک کا منشی ہوا کے گھوڑوں پر سوار رہتا ہے، چلا نہ جائے۔"

لڑکی نے گھاس کی گٹھی ہوئی گٹھڑی کندھے سے اتار کر وہیں کھیت میں رکھی۔ پھر وہ دوڑ کر مینڈ پر اگی ہوئی ایک بیری کے پاس آئی، تنے کی اوٹ میں پڑے ہوئے برتن کو خوب چھلکایا۔ ایلومونیم کا کٹورا بھرا اور لپک کر

بابا لوذر کے پاس جا پہنچی۔

بابا لوذر نے ایک ہی سانس میں سارا کٹورا پی کر رومال سے ہونٹ صاف کئے۔ بولا "تیرا نصیبہ اسی لسّی کی طرح صاف ستھرا ہو بیٹا" اور آگے بڑھ گیا۔

مدرسے کے برآمدے میں ڈاک کا منشی بہت سے لوگوں کے درمیان بیٹھا اپنے روزانہ کے فارم بھی پُر کر رہا تھا۔ اور دیہاتیوں کو معلومات سے بھی مستفید کر رہا تھا۔ "میرا سالا وہاں کراچی میں چپراسی کا کام کرتا تھا۔ جب وہ مرا ہے تو مجھے فاتحہ کیلئے کراچی جانا پڑا۔ بات یہ ہے دوستو کہ ایک بار کراچی ضرور دیکھ لو، چاہے وہاں گدھا گاڑی میں چلنا پڑے۔ اتنی موٹر کاریں ہیں کہ ہمارے گاؤں میں تو اتنی چڑیاں بھی نہیں ہوں گی۔ ایک ایک موٹر پر وہ وہ عورت ذات بیٹھی ہے کہ اللہ دے اور اللہ ہی لے۔ بندہ نہ لیتے ہیں نہ دیتے ہیں۔ بندوں کو پریوں سے کیا لینا دینا۔ اللہ کی قدرت یاد آجاتی ہے۔ نماز پڑھنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔ ایک سیٹھ کہہ رہا تھا کہ بس ایک اور بڑی لام لگ جائے تو کراچی ولایت بن جائے گا۔ کہتے ہیں کتنی بار لام لگنے لگی پر لگتے لگتے رہ گئی۔ کوئی نہ کوئی بیچ میں ٹانگ اڑا دیتا ہے۔ کہتے ہیں لام میں لوگ مریں گے۔ کوئی پوچھے لام نہ لگی تو جب بھی تو لوگ مریں گے۔ لام میں گولے سے مریں گے۔ ویسے بھوک سے مرجائیں گے۔ ٹھیک ہے نا"

"ٹھیک ہی تو ہے" ایک دیہاتی بولا۔ "پر منشی جی پہلے یہ بتاؤ

کہ لفافہ اِکنّی کا کب کرو گے ؟"

منشی نے اسے کچھ سمجھانے کے لئے سامنے دیکھا تو اس کی نظر ایک نقطے پر جیسے جم کر رہ گئی۔ اس کا رنگ فق ہو گیا اور وہ کھچی ہوئی آواز میں بولا "بابا نور آرہا ہے"

سب لوگوں نے پلٹ کر دیکھا اور پھر سب کے چہرے کملا گئے۔ بچّے مدرسے کے دروازوں اور کھڑکیوں میں جمع ہو کر "بابا نور۔ بابا نور کی سرگوشیاں کرنے لگے اور منشی نے انھیں ڈانٹ کر اپنی اپنی جگہ پر بٹھا دیا۔

سفید براق بابا نور سیدھا مدرسے کے برآمدے کی طرف آرہا تھا۔ اور لوگ جیسے سہمے جارہے تھے۔

برامدے میں پہنچ کر اس نے کہا۔ "ڈاک آگئی منشی جی ؟"

"آگئی بابا" منشی جی نے جواب دیا۔

"میرے بیٹے کی چھٹی تو نہیں آئی ؟" بابا نے پوچھا۔

"نہیں بابا" منشی بولا۔

بابا نور چپ چاپ واپس چلا گیا۔ دور تک پگڈنڈی پر ایک سفید دھبّا رینگتا ہوا نظر آتا رہا اور لوگ دم بخود بیٹھے اسے دیکھتے رہے۔

پھر منشی بولا "آج دس سال سے بابا نور اسی طرح آرہا ہے یہی سوال پوچھتا ہے۔ اور یہی جواب لے کر چلا جاتا ہے۔

بے چارے کو یہ یاد ہی نہیں رہا کہ سرکار کی وہ چٹھی بھی تو میں نے ہی اسے پڑھ کر سنائی تھی جس میں خبر آئی تھی کہ اس کا بیٹا برما میں بم کے گولے کا شکار ہو گیا۔ جب سے وہ پاگل سا ہو گیا ہے۔ پر خدا کی قسم ہے دوستو کہ اگر آج کے بعد وہ پھر بھی میرے پاس یہی پوچھنے آیا۔ تو مجھے بھی پاگل کر جائے گا۔"

گڑیا

اسکول سے واپسی پر وہ ابھی گھر سے کچھ دُور ہی تھی کہ اُس کا دل بے اختیار اچھلنے لگا۔ اُس کا جی چاہا کہ اس وقت اس کے پَر لگ جائیں اور وہ اڑ کر آن کی آن میں گھر کے اندر پہنچ جائے۔ اس دن اسکول میں سارے کا سارا وقت اس نے انتہائی بیتابی کے عالم میں چھٹی کا انتظار کرتے کرتے گذار دیا تھا۔ استانی جی لڑکیوں کو کیا بتا رہی ہیں یا آج نئے سبق میں اس نے کیا پڑھا ہے' ان باتوں میں سے وہ کسی کی طرف توجہ نہ کر سکی تھی۔ اس کے ذہن پر صرف ایک ہی خیال مسلّط تھا۔ اس کے دل میں صرف ایک ہی آرزو چٹکیاں لے رہی تھی — اور وہ خیال' وہ آرزو یہ تھی کہ جلد سے جلد گھر پہنچ کر حسب معمول بھائی کے ساتھ کھیل کود میں مصروف ہو جائے۔ چنانچہ جیسے جیسے گھر قریب آتا جا رہا تھا اس کی بے قراری بھی بڑھتی جا رہی تھی' اُس کے سینے میں ایک ایسی ہلچل برپا تھی جس میں بے چینی کم تھی اور خوشی زیادہ — اور ایک ہی لمحہ میں کئی چیزیں اس کی آنکھوں کے

سامنے آ ہیں اور اس کے اِرد گِرد پھیل گئیں۔ مسعود کا مسکراتا چہرہ، نئی خوب صورت رنگین گیند، چینی کی بڑی سی سفید سفید گڑیا اور نہ معلوم کیا کیا کچھ۔ وہ تیزی سے قدم اٹھانا چاہتی تھی بلکہ بھاگنا چاہتی تھی لیکن ایک تو اس کے پیچھے ہانپتی ہوئی مائی آہستہ آہستہ چلنے کے لئے مسلسل چیخ رہی تھی اور دوسرے بازار میں بھاگنا اور وہ بھی بغیر کسی اہم معاملے کے، اُسے اچھا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ تاہم وہ تیز تیز قدم اٹھانے لگی اور ہر لمحہ اس تیزی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ جس وقت وہ اپنی گلی میں داخل ہوئی تو یہ معلوم کئے بغیر کہ "مائی" اس سے کتنی دور رہ گئی ہے، وہ بھاگ کر گھر کے اندر چلی گئی۔ یکایک ایک گول سی چیز ہوا میں اچھلی، اس کے چہرے کے قریب آئی اور دوسرے ہی لمحے میں وہ درد سے بے قرار ہو کر "سی" کر کے وہیں زمین پر بیٹھ گئی۔ اتنے میں امّی کی آواز آئی — وہ رد کو اس کی شرارت پر کوس رہی تھیں۔ درد کی شدّت کے باوجود اس نے آنکھیں کھول دیں اور مسکرانے لگی۔ امّی ہمدردی سے پوچھ رہی تھیں:—

"زیادہ چوٹ تو نہیں آئی بیٹی؟ کتنے زور سے مُردار نے گیند ماری ہے میری بچّی کے منہ پر۔ دکھاؤ تو چہرہ۔ ہائے میں مر جاؤں، سوج گیا ہے۔ آنکھوں سے پانی بہہ رہا ہے۔ جب اُسے تیری پرواہ ہی نہیں ہے تو کیوں کھیلتی ہے اُس کے ساتھ؟"

ماں کے لہجے میں ہمدردی کی بجائے اب غصہ کا عنصر شامل ہو گیا تھا۔ وہ امّی کو بتانا چاہتی تھی کہ اُسے قطعاً کوئی تکلیف نہیں ہے۔ مگر یہ بات کہنے کے لئے اس کے پاس صبر کہاں۔ وہ گیند کے پیچھے بھاگی اور چند ہی لمحوں میں بھائی بہن کے قہقہوں سے فضا گونجنے لگی۔ رضیہ اپنی پیشانی کا درد بھول گئی تھی ——
کھانے کا بھی خیال نہ رہا۔ وہ بھائی کے ساتھ کھیلنے میں اس طرح محو تھی جیسے اسے نہ تو بھوک ہے نہ کسی اور چیز کا خیال۔ دونوں بچّے اچھل رہے تھے، بھاگ رہے تھے، قہقہے پر قہقہے لگا رہے تھے۔

آدھ گھنٹہ گذر گیا۔ وہ کھیل سے اکتائے نہیں تھے۔ اُن کی آنکھوں میں خوشی کی چمک بڑھتی جا رہی تھی۔ ان کے قہقہے، ان کی خوشی بھری آوازیں بلند سے بلند ہوتی جا رہی تھیں۔ امّی جان پھر بولیں ——

"ارے لڑکی! چھوڑ بھی نہ کھیل۔ بڑی ہٹ دھرم ہے تو۔ تیرے لئے وہ خاک بھی نہ لائے، گیند لائے ہیں اپنے لاڈلے کے لئے۔ تجھے تو سوتیلی بیٹی سمجھتے ہیں اور تو ہے کہ —— اِدھر آ ہاتھ دھو کر کھانا کھا۔"

رضیہ کو اب اپنی چینی کی گڑیا کا خیال آیا۔ ابّا جان سے اس نے کئی بار کہا تھا کہ میرے لئے چینی کی بڑی سی گڑیا

لادیجئے — اور آج تو انھوں نے پکّا وعدہ بھی کر لیا تھا، مگر گیند تو لے آئے تھے مسعود کے لئے اور اس کے لئے گڑیا نہیں لائے تھے۔ وہ بھائی سے لڑنا چاہتی تھی۔ جب بھی ابّا مسعود کے لئے طرح طرح کی چیزیں خرید کر گھر میں لاتے اور اس کے لئے کچھ نہ لاتے تو وہ بھائی سے ضرور لڑتی۔ یہ لڑائی چند منٹ کے بعد ختم ہو جاتی اس وقت جب دونوں کھیل کود میں مصروف ہو جاتے۔ رضیہ کو اس بات کا خیال بھی نہ رہتا کہ ابّا جی اس کے لئے کچھ بھی نہیں لاتے — مسعود نے گیند اس کی طرف پھینکی کہ لاؤ اسے اندر لے جا کر رکھ دے۔ لیکن اس نے غصّے سے گیند کو پرے پھینک دیا۔ بھائی کے ساتھ یہ اس کے انتہائی غم و غصّے کی علامت تھی۔ مسعود مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔ رضیہ کھانا کھانے میں مصروف ہو گئی۔ اس کے دماغ پر جو ہلکا سا بوجھ پڑا تھا وہ اب دور ہو گیا تھا۔

کھانے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد وہ جلدی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر امّی نے اس کا چہرہ دیکھ لیا تو مسعود پر برس پڑیں گی اور وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ امّی اس کے بھائی کو برا بھلا کہیں۔ اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر سامنے والے مکان پر پڑی۔ اس کی سہیلی اپنی گڑیا کو نئے نئے خوب صورت کپڑے پہنا رہی تھی۔ وہ بڑی دل چسپی کے ساتھ یہ منظر دیکھنے لگی۔ اُس وقت گڑیا نہ ملنے کا اسے بڑا

افسوس ہوا۔ اگر ابّا جی میرے لئے گُڈے لے آتے تو کیا اچھا ہوتا۔ میں بھی اُسے اچھے اچھے کپڑے پہناتی، خوب سجاتی، دُلہن بناتی اور سعیدہ کے گڈے کے ساتھ اس کا بیاہ کر دیتی۔ اسے گئی گُڑیوں کے بیاہ یاد آگئے۔ وہ ہر ایک کے بیاہ میں نقص ڈھونڈنے لگی۔ ایک سہیلی کنجوس تھی، اس نے اپنی گُڑیا کو اچھے کپڑے نہیں پہنائے تھے۔ دوسری سہیلی نے باجوں کا اچھا انتظام نہیں کیا تھا ——— اور ——— ایک اور سہیلی نے تو مہمانوں کی خاطر مدارات ہی نہیں کی تھی۔ وہ سوچنے لگی، آخر ابّا جان اس کے لئے گُڑیا کیوں نہیں لاتے اور اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ مسعود سے روٹھ جائے گی۔ اسے کئی گذری ہوئی باتیں یاد آگئیں۔ پرسوں اس نے اپنی سہیلیوں کو گھر پر بلایا تھا۔ بار بار کہنے کے باوجود ابّا پیسٹری نہیں لائے تھے۔ وہ کتنی شرمندہ ہوئی تھی ——— اس وقت ——— اور جب مسعود کے دوست آئے تھے تو پیسٹری کے علاوہ پھل بھی آیا تھا ——— نہیں، ابّا جی کو میری پرواہ ہی نہیں ہے۔ میں اب اُن سے کچھ بھی نہ کہوں گی، کبھی نہ کہوں گی۔ یکایک ایک اور خیال اس کے ذہن میں جاگ اُٹھا۔ امّی جان کی آنکھیں سوجی ہوئی کیوں تھیں۔ وہ سمجھ گئی کہ ابّا جی امّی پر ناراض ہیں۔ وہ اکثر ناراض رہتے ہیں۔ معلوم نہیں انھیں کیا ہو گیا ہے ——— امّی جان ماموں کے یہاں جانا

چاہتی ہیں، کیوں کہ وہ بیمار ہیں، تو ابّا جان کیوں روک رہے ہیں
——— وہ کرسی سے اٹھ بیٹھی اور یہ دیکھنے کے لئے اپنے کمرے
سے نکل آئی کہ امّی جان کیا کر رہی ہے - وہ اپنے کمرے میں نہیں
تھیں - وہ کمرے سے نکل آئی - اچانک ابّا جی کی گرجتی ہوئی آواز
گونجی - اس کی رفتار خود بخود مدھم پڑ گئی - وہ ابّا جی کے کمرے کی طرف
بڑھنے لگی - اب امّی کی آواز آئی ——— "میں نہیں جاتی!
نہیں جاتی! ہم عورتیں تو گڑیا ہیں - بے جان گڑیا، جن کے
سینے میں دل نہیں ہے، کوئی آرزو نہیں ہے ——— بے جان
پتلے - گڑیا، بس گڑیا ———"

امّی کی آواز میں آنسو چھلک رہے تھے اور اس نے محسوس
کیا کہ اس کے اپنے رخسار گیلے ہو گئے ہیں - امّی کمرے سے چلی
گئیں تو اس نے جھانک کر اندر دیکھا - ابّا جی اخبار پڑھ رہے تھے -
اس کی سہیلی کی گڑیا اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگی - وہ کمرے
میں گئی - ابّا جی اسے دیکھ کر بولے "کیا ہے؟" اس نے واپس
چلے جانے کا ارادہ کر لیا - لیکن ٹھہر گئی ——— ابّا جی ———!
وہ ہے نا ——— وہ میری گڑیا، ابّا جی، چینی کی بڑی سی
خوب صورت ——— آپ نے وعدہ کیا تھا ———" ایک ہی
فقرے میں اس نے سب کچھ کہہ دیا - سرخ آنکھیں شعلہ ناک ہو گئیں
"جاؤ اسی وقت دفع ہو جاؤ ———"

خاموشی کے ساتھ اس نے سر جھکا لیا - اب اس میں باپ کی طرف دیکھنے کی بھی ہمّت نہ تھی - ایک مختصر سے ہنگامے کے بعد گہری، غم ناک، بوجھل خاموشی چھا گئی - رضیہ کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ جس چیز کو اٹھائے پھر رہی تھی وہ چیز نیچے گر کر، فرش پر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ہے - وہ آگے بڑھتے ہوئے ڈرتی تھی - پیچھے جانا بھی نہیں چاہتی تھی ——— ابّا جی نے اپنی نگاہیں اخبار کے ورق پر جما دی تھیں ———

وہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور بغیر کچھ سوچے، بغیر کسی مقصد کے الماری کی کتابیں اُلٹ پلٹ کرنے لگی ——— دونوں کھڑکیوں کے پٹ کھول دیئے اور اسی وقت انھیں بند بھی کر دیا - میز پر سے میز پوش ہٹا دیا اور کلاک کو یوں ہی گھور گھور کر دیکھنے لگی - اب تک اسے درد محسوس نہیں ہوا تھا، مگر اب اسے اپنا چہرہ دُکھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا - آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا، پیشانی سوج گئی تھی ! ——— "کتنی زور سے ماری ہے کمبخت مسعود نے - اگر میری آنکھیں نکل جاتیں تو ——— میں اندھی ہو جاتی تو ——— کتنا بُرا ہے میرا بھائی ——— سب لڑکیوں کے بھائی بُرے بھائی ہی ہوتے ہیں ——— تنگ کرتے ہیں ——— بے چاریوں کو"

وہ صوفے پر بیٹھ گئی اور اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرنے

لگی ــــــــ اس کے سینے میں ہیجان برپا تھا۔ وہ آپا سے ایک
کچھ کہنا چاہتی تھی ــــــــ اور بھائی سے لڑنا چاہتی تھی
ــــــــ مگر کیوں ــــــــ؟ یہ اسے خود بھی معلوم
نہ تھا۔ وہ ایک مبہم ہیجان تھا۔ ایک ناقابل فہم اضطراب تھا۔
ایک عجیب قسم کی بے چینی تھی۔ سامنے چارپائی پر اس کا نیا
بوٹ پڑا تھا۔ بوٹ اس نے بڑے شوق سے خریدا تھا ــــــــ
مگر اب وہ حقیر سا معلوم ہو رہا تھا۔ اپنی کتابیں حقیر معلوم ہو رہی تھیں۔
کمرے میں اپنی ہر ایک چیز حقیر معلوم ہو رہی تھی ــــــــ یکایک
کسی کے ہاتھ اس کی آنکھوں کو چھوئے، اس کے دل میں ایک
لہر دوڑ گئی۔ وہ سمجھ گئی کہ یہ مسعود کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔
مسعود اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"بھلا بوجھو تو، میں نے ہیٹ کے نیچے کیا چیز چھپا رکھی
ہے ــ؟" بھائی نے پوچھا۔ اس کی آنکھوں سے شرارت کا
ایک نیا ارادہ جھانک رہا تھا۔

"میں کیا جانوں ــــــــ!" اس نے کسی قدر تلخی
سے جواب دیا۔

"دیکھو گی تو اچھل پڑو گی ــــــــ پہلے یہ بتاؤ انعام
کیا دو گی؟"

اس نے بھائی کی طرف دیکھا۔ مسکراتا ہوا شریر چہرہ اس کی

طرف بڑھ رہا تھا ——— آگے بڑھ کر پھر ہٹنے لگا۔

"میں کیا جانوں ———" وہ جَھل کر بولی۔

"لو ——— میں نے جتنے پیسے جمع کئے تھے، اُن کے خرید کر لایا ہوں ——— یہ گُڑیا چینی کی ——— اب تو خوش ہونا ——— کتنی خوب صورت ہے"!

اور واقعی چینی کی وہ گُڑیا بہت خوب صورت تھی ——— اتنی خوب صورت گُڑیا اس نے کبھی بھی دیکھی ہی نہ تھی ——— مسعود نے گُڑیا کو ہوا میں اچھالا اور پھر اسے پکڑ کر دروازے کے قریب کھڑا ہو گیا۔ رضیہ کی باچھیں کِھل گیئں ——— مسعود کو توقع تھی کہ وہ ابھی معمول کے مطابق اس کے گرد پیچھے بھاگے گی اور دونوں دیر تک ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے پھریں گے۔ ہر روز یہی کچھ ہوتا تھا۔ کبھی مسعود بہن کو پکڑنے کے لئے اپنی پوری رفتار سے بھاگتا تھا اور کبھی رضیہ بھائی سے آگے نکل جانے کے لئے انتہائی کوشش کرتی تھی! رضیہ کا دل بے تاب ہو گیا ———

"کتنا اچھا ہے میرا بھائی ———"

وہ پچھلے تمام شکوے بھول گئی ——— اور ——— بھائی کے پیچھے بھاگنے لگی ——— دونوں بچّوں کے قہقہوں سے فضا گونجنے لگی۔ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں، دوسرے کمرے سے صحن میں۔ یہ گردش جاری تھی۔ یکایک آپا جی کی غصہ سے بھری ہوئی

آواز گونجی ——— "او رجّو کی بچّی! کیا طوفان اٹھا رکھا ہے تو نے، مُردار۔ شرم نہیں آتی تجھے —؟"

رضیہ کے قدم وہیں رُک گئے۔ اس کے حلق میں کوئی چیز پھنس گئی۔ مسعود اسے گھر سے باہر چلنے کا اشارہ کر رہا تھا، مگر وہ بے حس و حرکت کھڑی تھی، جیسے ٹانگیں حرکت کرنے سے جواب دے چکی ہیں، جیسے وہ بولنے کی طاقت سے محروم ہو چکی ہے ——— جیسے اس کا دل ڈوبا جا رہا ہے۔

سامنے کمرے سے امی باہر نکلی۔ اس سے پیشتر کہ ماں کچھ کہے، وہ دوڑ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی اور سسکیاں بھرنے لگی۔ ——— ماں اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہی تھی ——— "کیا ہوا میری بچّی ——— ! میری گڑیا!"

———

رموزِ خاموشی

میں چار بجے کی گاڑی سے گھر واپس آ رہا تھا۔ دس بجے کی گاڑی سے ایک جگہ گیا تھا اور چوں کہ اُسی روز واپس آنا تھا لہٰذا میرے پاس اسباب وغیرہ کچھ نہ تھا۔ صرف ایک اسٹیشن رہ گیا تھا۔ گاڑی رکی تو میں نے دیکھا کہ ایک صاحب سیکنڈ کلاس کے ڈبے سے اُترے۔ ان کا قد بلا مبالغہ چھ فیٹ تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں، رعب دار چہرے پر ہوا سے ہل رہی تھیں۔ نیکر اور قمیص پہنے ہوئے پورے پہلوان معلوم ہوتے تھے۔ یہ کسی کا انتظار کر رہے تھے۔ دور سے انھوں نے ایک آدمی کو......

...... اپنے نوکر کو دیکھا۔ چشم زدن میں ان کا چہرہ غضب ناک سا ہو گیا۔ میں برابر والے ڈیوڑھے درجے میں بیٹھا تھا۔ ایک صاحب نے اس خوفناک جوان کو دیکھا اور آپ ہی آپ کہا "یہ خونی معلوم ہوتا ہے"۔ میں نے اُن کی طرف دیکھا اور پھر اِن خوف ناک حضرت کے غضب ناک

چہرے کو دیکھا اور دل ہی دل میں اُن کی رائے سے اتفاق کیا۔
آپ یقین کریں کہ اُن کی آنکھیں شعلہ کے مانند تھیں اور ڈکر کے
اُٹھتے ہی اس زور سے انھوں نے اس کو ایک قدم آگے بڑھا کر
ڈپٹا کہ وہ ڈر کر ایک دم پیچھے ہٹا اور گارڈ صاحب سے جو بالکل ہی
اُس کے قریب تھے لڑتے لڑتے بچا۔ گارڈ صاحب سیٹی بجانا ملتوی
کر گئے ایک طرف کو ہو گئے۔ انھوں نے اِک نگاہِ التفات ملازم پر
ڈالی۔ پھر اُن حضرت کی طرف دیکھا۔ دونوں مسکرائے۔ گاڑی چل دی۔

(۱)

گاڑی اسٹیشن پر رُکی اور میں اُترا۔ یہ حضرت بھی اترے۔
آپ یقین مانیں کہ میں سمجھا مجھے کوئی بلا لپٹ گئی۔ جب انھوں نے
ایک دم سے مجھے "ہاؤ" کرکے چپٹا لیا۔ دراصل انھوں نے کہا تھا
"تم کہاں"۔ اگر اُن کی توند کچھ نرم نہ ہوتی تو شاید میری ایک
آدھ پسلی ضرور شکست ہو جاتی۔ جھٹ سے ہاتھ پکڑ لیا اور ہنس کر
کہا "اب تمھیں نہیں چھوڑیں گے"۔ یہاں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ
مجھ کو فضول گوئی سے جتنی نفرت تھی ——— (اب نہیں ہے)
——— اُتنی کسی چیز سے نہ تھی۔ میں دیکھتا تھا کہ لوگ
باتیں کر رہے ہیں۔ خواہ مخواہ ایک دوسرے کی بات کاٹ رہا
ہے اور ہر شخص کی یہی کوشش ہے کہ دم بخود ہو کر میری ہی بات پر

سب کان دھریں۔ بسا اوقات میری غیر معمولی خموشی پر اعتراض ہوتا۔ مجھ سے شکایت کی جاتی کہ میں باتوں میں دلچسپی نہیں لے رہا ہوں۔ میں کوئی جواب نہ دیتا اور دل میں چچا سعدی کے وہ اشعار پڑھنے لگتا جو خاموشی کی تعریف میں تھے۔

ایسی صورت میں کہ میرا شعار یہ ہو، جب انھوں نے مجھے پکڑ کر کہا" اب تمہیں نہیں چھوڑیں گے" تو ممکن تھا کہ میں خاموشی سے کام لیتا۔ لیکن یہاں تو بغیر بولے کام نہ چل سکتا تھا۔ مگر قبل اس کے کہ میں کہوں کہ" حضرت آپ کون ہیں اور مجھ کو کیوں پکڑا ہے اور آخر آپ مجھ کو کیوں نہ چھوڑیں گے اور کیسے نہ چھوڑیں گے؟" انھوں نے بغیر میرا جواب یا میری بات سنے ہوئے سلسلۂ کلام کو جاری رکھا ......" تم بہت دنوں بعد ملے ہو ...... کہاں تھے .... کیسے ہو .... والد صاحب تو بخیریت ہیں .... اور لوگ کہاں ہیں .... ابے نالائق .... او نامعقول ...... یہ دیکھ ...... یہ دیکھ ...... آنکھیں کھول .... ارے آنکھیں کھول" ملازم پر کھڑے دانت پیس رہے تھے۔ میرا شبہ کہ مجھے تو نہیں کہہ رہے ہیں، زائل ہو چکا تھا۔ در اصل نہ انھیں میرے جوابات کی ضرورت تھی اور نہ مجھ میں ہمّت۔ بعض لوگ واقعی حاضر جواب ہوتے ہیں۔ کاش میں بھی ویسا ہی ہوتا۔ شاید ان کے سوال کے بعد اور دوسرے

سوال سے کچھ پہلے مرے سے بیٹھا ہوا تانگہ میں گھر کی طرف جا رہا ہوتا۔ میں اب ذرا اپنے کو سنبھال کر اُن سے غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہا تھا اور اس میں مجھے کامیابی ہوتی بھی معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ "معاف کیجئے گا......" تو نہایت مناسب الفاظ تھے جو مجھ کو مل گئے تھے اور میں نے کہا تھا کہ "معاف کیجئے گا" ...... مگر انھوں نے فوراً ہاتھ پکڑ کر کہا "جی نہیں...... ناممکن ہے" اور پھر اسی سلسلہ میں کہا "اسباب نہیں ہے؟" اور بغیر جواب کے انتظار کئے ہوئے پھر خود ہی فوراً کہا "شاید دن بھر کے لئے آئے ہو گے۔ خیر کوئی ہرج نہیں۔ اب دو تین دن تمہیں نہ چھوڑوں گا" ایک قہقہہ لگایا اور بڑے زور سے کہا "میں نہیں چھوڑوں گا...... نہیں چھوڑ سکتا" میں نے دل میں سوچا کہ بھاگوں...... ہاتھ چھڑا کر، مگر اول تو میری پتلی کلائی گویا پنجۂ آہنی میں تھی اور پھر اسٹیشن کی بھیڑ۔ یہ خیال خام تھا۔

(۲)

میرا ہاتھ پکڑے پکڑے مجھ کو لے جا کر انھوں نے اپنے ساتھ گاڑی پر بٹھایا۔ گاڑی پر بیٹھتے وقت میں ذرا رکا کہ کہوں کہ جناب، آپ مجھ کو کیوں اور کہاں لئے جا رہے ہیں۔ میں نے ذرا گلا صاف کر کے کہنا چاہا کہ انھوں نے گویا جبراً ہاتھ پکڑ کر گاڑی میں

بٹھا دیا اور خود بھی بیٹھ گئے اور بیٹھتے بیٹھتے کہا " میں تمہیں نہیں جانے دوں گا .... والد صاحب تو بخیر ہیں؟" میں نے کہا " بخیریت ہیں " ــ " اور .... " وہ بات کاٹ کر بول اٹھے " اور سب ؟" اور پھر کہا " سب اچھی طرح ہیں .... ارے میاں یہ کیا واہیات ہے ۔ سنا ہے کہ تمہارے والد صاحب نے ایک اور شادی کر لی ہے ۔ یہ خبر کہاں تک صحیح ہے ؟ " ــ " الہی خیر " میں نے دل میں کہا ۔ کیوں کہ میری والدہ صاحبہ عرصہ ہوا مر چکی تھیں لیکن پھر بھی بحمد اللہ دو " والدائیں " موجود تھیں ۔ کیا یہ ممکن ہے کہ والد صاحب قبلہ کی آبادی پسند طبیعت نے .... یا پھر مجھ بیسیر کے حالِ زار پر رحم کرتے ہوئے دو مائیں نزولِ شفقت مادرانہ کے لئے ناکافی سمجھتے ہوئے ایک کا اور اضافہ فرمایا ہو ــ میں نے کچھ ہکلاتے ہوئے کہا " .... مجھے نہیں معلوم " اور معاً میں نے سوچا کہ ان حضرت کو شاید میں نے پہچانا نہیں اور ان کی تمام جاں محامہ کاروائی کہیں حق بجانب تو نہیں ۔ آخر کیوں نہ معذرت کر کے دریافت کر کے آئندہ کے لئے تعارف کر لوں ۔ مگر میری کم گوئی ــــــــ (اب تو باتونی ہوں) ــــــــ اور سوالات کرنے سے بچنے کی عادت ــــــــ (بحمد اللہ اب فوراً سوال کرتا ہوں) ــــــــ کا خدا بھلا کرے یہ مجھ میں کمزوری تھی ۔ میں نے فوراً محسوس کیا کہ یہ عیب ہے جس کو میں نہیں سمجھا کیا ۔ مگر کہیں ان باتوں کے متعلق

غور کرنے سے طاقتِ گفتار تھوڑی آجاتی ہے۔ دستِ تأسف ملتا
تھا اور کچھ کہنا چاہتا تھا مگر بات بولا ہی نہ جاتا اور اگر ہمت کر کے
بولنے کو ہوتا تو فوراً وہ سوال کر دیتے۔ میں یہی کہتا رہا کہ اب ان سے
معاملہ صاف کر لوں اور اب پوچھوں کہ گاڑی ایک کوٹھی کے پھاٹک
میں داخل ہو گئی۔ مجھے بہانہ ملا اور سوچا کہ اب اطمینان سے اُن سے
معذرت کر لوں گا کہ حضرت میں نے آپ کو نہیں پہچانا۔ گاڑی باغ
میں داخل ہوئی اور یہ حضرت بولے "پچھلی دفعہ جو تم آئے تھے تو
تم نے وہ انگور کی بیل نہ دیکھی ہوگی .... اس کی جڑ میں
تین بندروں کے سر گڑوائے ہیں" میں بھلا اس کا کیا جواب دیتا۔
کیوں کہ عمر میں آج پہلی مرتبہ یہاں آیا اور وہ بھی پکڑا ہوا! مگر
زبان سے لفظ "بندر" نکل گیا۔ انھوں نے کچھ فخریہ لہجے میں شاید
اسی نیت سے کہا کہ میں اُن سے تعجب سے پوچھوں کہ صاحب،
بندروں نے کیا خطا کی جو اُن کے ساتھ یہ چنگیزی کارروائی کی گئی
.... اور جب وہ کچھ مناسب وجوہ پیش کریں تو اُن کی
معلومات پر دنگ رہ جاؤں۔ شاید انھوں نے اسی خیال سے کہا
"جی ہاں بندر........ بندروں کے سر" مگر میری خاموشی سے
ان کی امید منقطع ہو گئی تو وہ خود ہی بولے "آپ کو نہیں معلوم.....
.... در اصل فنِ باغبانی پر ایک کتاب لکھ رہا ہوں۔ بات
یہ ہے کہ بندر کے سر کی کھاد انگور کے لئے لاجواب ہے" میں

دل میں سوچ دیا تھا کہ آئندہ انگور اگر ملے تو کھاؤں یا نہ کھاؤں۔
باغبانی کا تذکرہ چھوڑ کر انھوں نے ایک چوکھونٹے چبوترے
کی طرف مجھے دکھایا۔ انگریزوں کی قبریں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔
کوئی نئی بات نہ تھی۔ پرسی! ہاں اس نام سے بھی واقف تھا۔
جو بھی اخبارات پڑھتے رہے ہیں وہ سر پرسی کاکس ہائی کمشنر عراق
کے نام اور ان کے تدبّر اور پالیسی سے واقف ہی ہیں مگر یہاں
ان کی قبر کیسی؟ ان کے کوئی عزیز ہوں گے۔ میں نے بجائے
سوال کرنے کے حسب عادت دل ہی میں کہہ کر اطمینان کر لیا۔ برآمدے
کے پاس پہنچ رہے تھے۔ گاڑی بالکل آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔
اور وہ اُسی طرح بولے "مجھے پرسی کے مرنے کا بہت افسوس
ہوا اور ایک روز میں نے کھانا نہیں کھایا۔" مجھے قطعی یقین ہو گیا
کہ ان کی مسٹر پرسی سے دوستی ہوگی۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ
ایک چھوٹا سا کُتا دوڑتا ہوا گاڑی کے پاس پہنچا۔ بنگلہ ابھی دور
تھا اور یہ مالک کے استقبال کو آیا تھا۔ میں غور سے دیکھ رہا تھا کہ
یہ کرٹ کتنا کہاں تک ہو سکتا ہے کہ وہ بولے "یہ۔ دیکھئے۔ یہ عجیب
رہ گیا اور پرسی مر گئی۔ بڑی لاجواب کُتیا تھی۔" اِدھر میں متعجب تھا اور
اُدھر وہ تعریف کے لہجے میں کہنے لگے "آپ یہ خیال کیجئے کہ اتنی
سی کُتیا تھی مگر اکیلی بلّی کو مار ڈالتی تھی اور پھر تعریف ایک اور تو کی
تھی وہ یہ کہ اگر کہیں کوئی اجنبی بنگلے کے احاطے میں نظر پڑ جائے تو

بس اسی کی خبر ہی تو لے ڈالتی تھی۔" میں چونکا ہوا۔ دل ہی میں میں نے کہا کہ اچھا ہوا کہ پرسی مرگئی اور آج کو نہ ہوئی۔ پھر غور کیا کہ یہ کُتا بھی تو اسی کے ساتھ کا ہے! میں جناب کُتّوں سے بہت ڈرتا ہوں اور بالخصوص ان نالائق کُتّوں سے جو حالانکہ کٹ کھنے نہ ہوں مگر دوڑ پڑتے ہوں۔ میں نے پرسی کی قبر کی طرف اطمینان سے نظر ڈالی اور پھر اس "کُتّے" کو یعنی پرسی مرحومہ کے شوہر کو دیکھا۔ اتنے میں گاڑی برآمدے میں آکر لگی اور میں نے دیکھا کہ ایک خوفناک بُل ڈاگ انگڑائی لے کر اٹھا۔ اتنے میں ہم دونوں اُتر پڑے۔ چھوٹا کُتّا تو دُم ہلا ہلا کر اپنے مالک کے قدم میں لوٹ رہا تھا، مگر یہ سنجیدہ بزرگ یعنی بُل ڈاگ صاحب میری روح قبض کرنے میں مشغول ہو گئے۔ یعنی برآمدے سے اتر کر انھوں نے مجھے سُونگھا۔ میری سانس رُک گئی اور چہرے پر ایسی ہوائیاں اڑنے لگیں کہ انھوں نے محسوس کیا اور مسکرا کر کہا" اجی یہ تو وہی پرانا ٹامی ہے۔ بس صورت ہی ڈراؤنی ہے کاٹنا تو کم بخت جانتا ہی نہیں۔ بہت کیا اس نے اور بڑی بہادری دکھائی تو بس لپٹ جاتا......." انھوں نے میری سراسیمگی پر ایک قہقہہ لگایا۔ کیوں کہ میں پھاند کر گاڑی میں پہنچ چکا تھا۔" لاحول ولاقوۃ۔ تمہارا کُتّوں سے ڈرنا نہ گیا۔ یہ تو وہی پرانا ٹامی ہے" یہ کہتے ہوئے انھوں نے ہاتھ پکڑ کر

مجھے گاڑی سے اُتارا اور مجھے تیزی سے بے تکلف کمرے میں داخل ہونا پڑا۔ خوش قسمتی سے کُتّوں نے ایک گلہری کو دیکھ پایا جس کے پیچھے وہ ایسا دوڑے کہ نظروں سے اوجھل ہوگئے اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

(۴۴)

پہنچتے ہی انھوں نے آواز دی "کھانا لاؤ" خدا خیر کرے۔ میں نے دل میں کہا یہ کھانے کا کون وقت ہے۔ بہت جلد ہاتھ دھوئے گئے۔ انکار سے وہ کاہے کو مانتے۔ میں نے بھی کہا ع

ایں ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر

کھانے کی میز پر گرم کیا ہوا پلاؤ، شامی کباب، انڈوں کا قورمہ، اور دوسرے لوازمات تھے۔ میں رکابی کے ایک طرف کے چاول اٹھاکر دوسری طرف رکھ کر ٹیلا بنانے میں مشغول ہوا اور انھوں نے تیزی سے چاول کھانا......... نہیں میں نے غلط کہا، بلکہ پینا شروع کیا۔ شاید وہ چبانا نہ جانتے تھے۔ یا چاولوں کو چبانے کی چیز نہ خیال کرتے تھے۔ "عارف میاں کہاں ہیں؟" چلّا کر ملازم سے انھوں نے کہا "اُن کو جلدی بلاؤ" اور میری طرف مسکراکر کہا "تمہارا بھتیجا تو آیا ہی نہیں۔ نہا رہا ہوگا۔ ورنہ وہ ضرور میرے ساتھ کھانا کھاتا ہے" آپ یقین کریں کہ میں نے

اِدھر اُدھر بھاگنے کی نیت سے دیکھا۔ بھتیجا! یہ لفظ بھتیجا میرے لئے لفظ شیر سے کم نہ تھا اور پھر کھانا کھاتے ہیں۔ جس کے ایک نہ دو بلکہ ہیئے سوتیلے ملا کر ساڑھے چودہ بھتیجے ہوں اُس سے پوچھئے کہ ایسی دُنیا اچھی یا دوزخ؟ واللہ اعلم، گنہ گاروں کی ایذا رسانی کے لئے وہاں دوزخ میں بھتیجے بھی ہوں گے یا نہیں۔ اگر میرے بھتیجے جنت میں گئے تو میں دوزخ کی زندگی کو بدرجہا پرسکون اور جائے پناہ تصور کروں گا۔ میں یہ کہنے میں مبالغہ سے کام نہیں لیتا۔ کیوں کہ چودہ پندرہ بھتیجے اور سب ایک جگہ رہتے ہوں تو غریب چچا کا جو حال ہوگا اس کا اندازہ خود لگا لیجئے۔ ویسے ہی کیا کم میری جان گھر کے پندرہ بھتیجوں نے مصیبت میں ڈال رکھی تھی جو یہ ایک اور نکلا!! کوئی خودکشی کرتا تو میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا کہ اُس کے کتنے بھتیجے ہیں۔ ایک ہو تو خیر، ورنہ دو ہونے کی صورت میں مجھ کو خودکشی کرنے کی وجہ معلوم کرنے میں دیر نہیں لگتی تھی۔ لفظ بھتیجا کے معنی کچھ بھی ہوں، مگر میری دانست میں ملک الموت یا جہنم کے سکریٹری کا نام بھی بھتیجا ہونا چاہئے۔ میں اسی فلسفہ پر غور کرتا رہا تھا کہ وہ بولے تمہارے اَب کتنے بچے ہیں؟" میں اس کا کیا جواب دیتا، کیونکہ میری شادی ہی نہیں ہوئی ہے۔ لیکن شاید اُن کو جواب کی ضرورت ہی نہ تھی۔ کیوں کہ فوراً ہی انھوں نے بغیر میرے جواب کا انتظار

کئے ہوئے کہا "تمہاری بیوی کہاں ہیں ؟ — تمہارے کتنے بچے ہیں ؟" مجھ کو مجبوراً واقعہ بیان کرنا پڑا کہ "ایک بھی نہیں —" چاول کا بڑا سا لقمہ جو انہوں نے منہ میں رکھا ہی تھا "ارے" کے ساتھ نگل کر بولے "ارے .... دونوں ....

دونوں بے چارے .... یہ آخر کب ؟ .... بھئی بات تو یہ ہے کہ خدا اگر بچے دے تو زندہ رہیں، ورنہ ان کا ہونا اور پھر مرجانا تو بس .... خدا کی پناہ ...." وہ شاید مجھ سے ہمدردی کر رہے تھے " تمہاری بیوی کا نہ معلوم کیا حال ہو گا !" میں خود مجبور تھا تو بھلا اُن کو کیا بتاتا کہ اس کا کیا حال ہو گا ۔ اسی دوران میں جناب وہ آگیا ! کون ؟ اجی وہی ملک الموت یا جہنم کا سکریٹری یعنی میرا منہ بولا بھتیجا عارف ۔ میں گھبرایا کیوں کہ وہ ببر کی طرح "بابا ! بابا !" کا نعرہ مارتا چلا آرہا تھا ۔ میں سنبھل بیٹھا اور مدافعت کی صورتوں اور امکانات پر غور کرنے لگا کہ اس کا رُخ بدل گیا ۔ وہ اپنے بابا پر گرا ۔ تیزی سے وہ بھی پلاؤ پینے میں مشغول ہو گیا ۔ والد بزرگوار نے فرزند ارجمند سے کہا " تم نے چچا کو نہ تو سلام کیا نہ ٹاٹا کیا، ٹاٹا .... ٹاٹا" کئی مرتبہ پھر تقاضہ کیا " سلام کرو، ٹاٹا کرو .... سلام کرو" بالفاظِ دیگر مجھ سے تقاضہ ہو رہا تھا کہ کہوں زندہ باد ۔ مگر حضرت، مجھ سے یہ ریاکاری ہونا ناممکن تھی ۔ ایک فرد ویسے ہی خاموش آدمی تھا (اب نہیں ہوں) ———

اور حتی الامکان بغیر بات چیت کئے کام نکالنا چاہتا تھا اور پھر ویسے بھی بھتیجوں کو دعا دینے کے خلاف۔ یہ نہ خیال کیجئے گا کہ میں خدانخواستہ چاہتا تھا کہ وہ مرجائیں۔ اجی ہزار برس زندہ رہیں، مگر دور رہیں۔ بار بار کے تقاضے سے تنگ آکر آخر بھتیجے صاحب نے میری چھاتی پر کودوں دل ہی ڈالی۔ یعنی اپنا سیدھا ہاتھ جو پلاؤ کے گھی میں تربتر تھا، میرے گھٹنے پر رکھ کر اپنا بایاں ہاتھ ٹاٹا کے لئے بڑھا دیا۔ میں دم بخود رہ۔ اپنے صاف پتلون پر چکنائی کا دھبہ دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ کیونکہ میرے پاس یہی ایک اچھا پتلون تھا، جو بھتیجوں کی دست برد سے اب تک نہ معلوم کس طرح محفوظ تھا۔ ادھر تو میں نے چاول گھٹنے پر سے صاف کئے اور انھوں نے کہا "بائیں الٹے ہاتھ سے؟" کاش وہ حضرت بھتیجے صاحب پیشتر ہی ٹاٹا (مصافحہ) کے لئے داہنا ہاتھ بڑھاتے اور بایاں ہاتھ شوق سے میرے گھٹنے پر رکھ لیتے۔ میں نے جبراً و قہراً ہاتھ ملایا اور دل میں کہا ظالم! تو نے مجھے بے موت مارا۔ میرے پاس ایک ہی پتلون تھا جس کو تو نے یوں خراب کیا۔

(۴)

میں نے اطمینان کا سانس لیا، جب یہ عزیز از جان بھتیجا یہ کہہ کر کھانا چھوڑ کر ایک دم سے بھاگا "بلا، بلا" گویا وہ تیز دوڑتا ہی

ہو گا یا پھر یہ روایت بالکل صحیح ہے کہ لاحول پڑھنے سے شیطان بُری طرح بھاگتا ہے - میں لاحول پڑھ رہا تھا اور اس کے اثر کا دل ہی دل میں قائل ہو رہا تھا۔ "آپ نے ہڈی کی تجارت آخر کیوں چھوڑ دی ؟" ــــ انھوں نے ایک ہڈی کا گودا نکالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ــــ ناظرین غور کریں کہ ہڈی کی تجارت کو میں چھوڑتا تو جب، کہ اگر میں نے کبھی یہ تجارت شروع کی ہوتی - کہنے کو ہوا کہ کہوں حضرت بھلا ہڈّی کی تجارت سے مجھ کو کیا تعلق - مگر تو بہ کیجئے وہ تو تمام اپنے سوالات کا جواب شروع ہی سے خود دے رہے تھے، یا پھر جواب کا بغیر انتظار کئے ہوئے دوسرا سوال کر دیتے تھے - مجھے بھلا کوئی زرّین موقع کیوں دینے جو میں خلاصہ پاتا - قبل اس کے کہ میں نوالہ ختم کر کے کہوں، انھوں نے کہا " تجارت والا تو تجارت ہی کرتا ہے، ہڈی کی نہ سہی پسلی کی سہی "۔ یہ کہہ کر انھوں نے زور سے قہقہہ لگایا۔ میں اُن کے حلق کی گہرائی پر غور کر رہا تھا کہ وہ آ پہنچا ملک الموت..... وہ موذی، بلّا ہاتھ میں لئے ہوئے جنگھاڑتا ہوا آیا اور کھانا شروع کرنے کی بجائے پلّے کی تلوار بنا کر بینترے بدل بدل کر رقص کرنے لگا - وہ گویا پیٹ کے ہاتھ نکال رہا تھا - میرے میزبان یا یوں کہیے کہ صیاد کا کیا ہوا - بدقسمتی سے وہ چاول پینے کی بجائے اگر کہیں کھانے کے عادی ہوتے تو ہنسی کی وجہ سے ضرور ان کے گلے میں پھندا پڑ جاتا۔ کیوں کہ ان کی دانست میں کھانے میں ہنسی مخل نہیں ہو سکتی تھی - وہ خوب

ہنس رہے تھے " بخدا اس شریر کو دیکھیے " میں اس کا کیا جواب دیتا، کیوں کہ دیکھ ہی رہا تھا اور جانتا تھا کہ جو دم گذر رہا ہے وہ غنیمت ہے۔ بنوٹ کا قاعدہ ہے کہ سارا کھیل بس نظر کا ہوتا ہے۔ غنیم سے جب تک آنکھ سے آنکھ ملی رہے یا غنیم کے حرکات پر جب تک نظر جمی رہے اس وقت تک خیر ہے ورنہ اِدھر آنکھ جھپکی ادھر اُدھر مار کھائی۔ یہ سُنتا ہی تھا مگر آج ثابت ہو گیا۔ دو مرتبہ اس کا ریلا میرے سر پر سے ہو کر نکل گیا اور اگر میں سر نہ بچا جاؤں تو سر قلم تھا۔ انھوں نے صرف " ہا ہیں " کہا۔ میں ٹکٹکی باندھے اس گردن زدنی بھتیجے کی طرف دیکھ رہا تھا کہ میرے محبّی میزبان نے میری کم خوری کا گِلہ کر کے کہا " یہ لیجیے، کباب نہیں کھائے " اُدھر میری نظر چوکی اور اِدھر زور سے میرے منھ پر بلّا پڑا کہ میری ناک پچّی ہو گئی۔ نہیں، بلکہ مجھ کو ایسا معلوم ہوا کہ شاید میری ناک عینک کے ساتھ اڑی چلی گئی۔ فوراً پہلے تو میں نے اپنی ناک کو دیکھا اور اس کو موجود پا کر لپک کر میں نے عینک اٹھائی۔ بھتیجے صاحب بھی گر پڑے تھے۔ عینک کا ایک تال ٹوٹ گیا تھا۔ یا علیؑ کہہ کر انھوں نے بیٹے باز کو سنبھالا اور میں نے اپنی عینک کو۔ " تم بڑے نالائق ہو " ڈانٹ کر انھوں نے لڑکے سے کہا۔ مجھ سے معذرت کی اور پھر اس سے کہا کہ

"معافی مانگو۔" حالاں کہ میں خود اُن سے معافی اور پناہ مانگ رہا تھا۔ وہ چپ ہوا تو کہا "اچھا اب جاؤ اور اپنی امّی جان سے کہنا کہ چچا حامد آئے ہیں۔" اُدھر انھوں نے یہ کہا اور اِدھر میں بے چین ہوا۔ کیوں کہ میں قطعی حامد نہ تھا۔ اِدھر مجھے اپنا نام معلوم ہوا اور ادھر میری طبیعت پر خلجان سوار ہوا۔ کھانے سے میں نے ہاتھ کھینچا اور حسب عادتِ قدیم گھُٹ کر رہ گیا۔ مگر میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ بول اُٹھے "دیکھیے کتنی جلدی جاتا ہے۔" میں نے دل میں کہا "میں لاحول سے اور بھی تیز یا کر دوں گا۔ کسی طرح یہ پیچھا تو چھوڑے۔"

(۵)

کھانا ختم کر کے ہم برآمدے میں آئے۔ انھوں نے ایک بڑا سگار سلگایا اور دوسرا مجھے دیا۔ میں نے اِنکار کیا۔ "ارے! تم نے چھوڑ دیا؟ یہ کیسے؟ پہلے جب آئے تھے تو خوب پیتے تھے! واقعی کمال کر دیا۔ بہت اچھا کیا بہت اچھا کیا۔ واقعی خراب چیز ہے۔" پھر ایک مختصر سا لکچر تمباکو کے نقصانات پر دیتے ہوئے کہا "اب تم بھی اچکن اُتار کر ذرا ہاتھ منہ دھو ڈالو۔" دراصل ہم دونوں

خیر سے سفر کے بعد آتے ہی کھانے پر ٹل گئے۔ اتنے میں انھوں نے چلّا کر کہا "ارے بھائی ٹامی کو کیوں باندھ دیا ہے؟ کوئی ہے ــــ!" ایک آدمی آ کھڑا ہوا۔ اسی سے انھوں نے پوچھا کہ "ٹامی کو کیوں باندھ دیا ہے؟" اس نے میری طرف اشارہ کر کے کہا "آپ کی وجہ سے"۔ انھوں نے کہا "کیا بکتے ہو۔ اس کو فوراً کھولو۔ یہ وقت کتوں کے باندھنے کا نہیں ہے"۔ میری طرف دیکھ کر کہا "دراصل یہ وقت تو کتوں کے کھولنے کے لئے مخصوص ہے......"

"...... دیکھ! چھوٹے کتّے کو بھی" یہ نوکر سے کہا۔ میں نے دل میں کہا یک نہ شد دو شد۔ خدا خیر کرے۔ واللہ اعلم کتوں کے مالکوں کو کتّے چھوڑنے میں کیا لطف آتا ہے۔ یہ نہیں دیکھتے کہ وہ آنے جانے والے پر دوڑتے ہیں۔ ہاں، کتّوں کے نوکر پر مجھے یاد آیا کہ ایک کتّا ہمارے یہاں بھی پالا گیا تھا۔ بھتیجوں نے آکر مجھ غریب چچا کے اوپر کوئی کرم کیا تو یہ کیا کہ اس کو ایک حوض میں نہلاتے نہلاتے ڈبو دیا۔ کیونکہ اس کو دن بھر نہلاتے تھے۔

"آیئے باغ میں چلیں ــــــ" انھوں نے مجھ سے کہا۔ جھٹ پٹا وقت تھا اور ہم اٹھنے ہی کو تھے کہ ایک نوعمر خاتون بہت اچھی صورت شکل کی گلابی کپڑے پہنے نکلیں۔ میں نے

دیکھا ہی تھا کہ " ارے " کہہ کر وہ ایک دم سے لوٹ گئیں۔ میرے میزبان گھبرائے......... اُدھر مُڑ کر دیکھا اور ہنسے اور بولے " آؤ بھئی، آتی کیوں نہیں ہو؟ " دوسری طرف کروٹ بدل کر مجھ سے بولے - بہت دن ہو گئے۔ شاید تم کو پہچانا نہیں - تم میں تغیّر بھی تو بہت ہو گیا " میری طرف غور سے دیکھ کر بولے اور پھر کہا " ...... ارے آتی کیوں نہیں ہو؟ .... بڑی احمق ہو - یہ کہتے ہوئے اٹھے۔ اب میرے لئے بھاگنے کا بہترین موقع تھا - کیوں کہ وہ کمرے میں گئے - میں چاہتا ہی تھا کہ اس زرّیں موقع سے فائدہ اٹھاؤں - کہ کیا دیکھتا ہوں کہ وہی خوف ناک کتّا ٹامی مع چھوٹے کتّے کے ڈاک گاڑی کی رفتار سے اسی طرف چلا آرہا ہے - یا اللہ، اب میں کیا کروں! ایک طرف سے کتّے آگئے تھے اور دوسری طرف بیگم صاحبہ سے مل کر غلط فہمی رفع ہونے والی تھی - اگر کتّوں نے مجھے گھیر نہ لیا ہوتا تو میں بھاگ گیا ہوتا — ! میرا دل دھڑک رہا تھا —— اور اب میں ایک عجیب ہی مصیبت میں تھا - بیگم صاحبہ سے انھوں نے کچھ باتیں کیں اور انھوں نے آدھی آنکھ سے مجھے جھانک کر دیکھا - میں دم بخود تھا - گویا میری روح پرواز کر گئی - کیوں کہ میں دوڑنے کے امکان پر غور کر رہا تھا

اور ان کے حملے سے بچنا، ایسے کہ کتوں سے بھی بچت ہو، صرف ایک بڑا گملا پھاند کر ممکن تھا۔ میں نے گملے کی اونچائی پر نظر ڈالی۔ میاں بیوی میں تیزی سے کچھ باتیں ہوئیں اور وہ کچھ سنجیدہ صورت بنائے ہوئے نکلے۔ میں بھاگنے کے لئے آمادہ ہو کر کھڑا ہوا مگر میرے پیر زمین نے پکڑ لئے۔ وہ میرے قریب پہنچے۔ میں نے کتوں کی طرف دیکھا اور پھر گملوں کی طرف .... دل میں سوچا کہ پھاند جاؤں گا اور بائیں طرف سے گھوم کر احاطہ کی دیوار سے نکل جانا ممکن ہے .... وہ آ گئے .... میں جانتا تھا کہ اگر انھوں نے گھونسہ مارا تو میں کلائی سے روکوں گا۔ کلائی تو ٹوٹ ہی جائے گی مگر منہ بچ جائے گا۔ انھوں نے اپنے جوتے کی جھینک کو دیکھا۔ میں نے کمرے کی طرف دیکھا کہ بیگم صاحبہ جھانک رہی ہیں۔ "معاف کیجئے گا" میرے میزبان نے نہایت نرمی سے کہا "شاید غلط فہمی .... مجھ کو غلط فہمی ہوئی" میں نے سر جھکا کر کہا "مجھ کو خود افسوس ہے" وہ بولے "جناب کا اسم گرامی؟" میں نے اپنا نام اور پتہ وغیرہ بتایا۔ وہ ایک دم سے بولے "آپ کے والد صاحب .... افوہ! .... آپ!

.... آپ کے والد صاحب سے تو دیرینہ مراسم ہیں۔
آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔"
انھوں نے ہاتھ ملا کر کہا "کس قدر آپ میرے دوست
کے ہم شکل ہیں۔ بالکل وہی .... ہو بہو وہی۔
صرف آنکھیں آپ کی ذرا چھوٹی ہیں اور پیشانی ذرا کم کشادہ
ہے ورنہ آپ بالکل ہو بہو وہی ہیں۔ ہاں اور وہ عینک
نہیں لگاتے اور ذرا ہونٹ ان کے پتلے ہیں ورنہ بالکل آپ
کی صورت شکل ہے۔ بس صرف کچھ ناک آپ کی زیادہ بڑی
اور چوڑی ہے اور .... تو وہ عینک کی وجہ سے
.... آپ کی عینک کیا ہوئی؟" میں نے بتایا کہ چونکہ
اس کا ایک تال ٹوٹ گیا ہے، میں نے جیب میں رکھ لی۔
انھوں نے عینک کے ٹوٹنے پر اظہار تاسّف کیا۔ پھر انھوں
نے بڑے اخلاق سے کہا "کوئی ہرج نہیں، نہ سہی۔ اب تو
ہم آپ بہترین دوست ہیں۔" یہ کہہ کر انھوں نے پھر گرم جوشی
سے ہاتھ ملایا۔ میں نے اجازت چاہی تو انھوں نے اصرار کیا۔
مگر میں نے نہ مانا، تو کہنے لگے کہ گاڑی تیار کرائے دیتا ہوں۔
مگر میری کم بختی میں نے نہ مانا۔ انھوں نے بہت کچھ کہا، مگر
میں نے نہ مانا۔ تھوڑی دور تک باغ کے پہلے موڑ تک وہ
مجھ کو رخصت کرنے آئے اور دوبارہ آنے کا پختہ وعدہ لیا۔

وہ تو واپس ہوئے اور میں تیزی سے پھاٹک کی طرف چلا، مگر
حضرت یا وہ کتے اپنے ساتھ نہ لے گئے اور وہ دُم ہلاتے، کان
پھڑپھڑاتے میرے پیچھے چلے آرہے تھے۔ میرا دل الٹنے لگا اور
میں نے اپنی رفتار کچھ تیز کی۔ کتّے بھی کم بخت تیز ہوئے۔
میں اور تیز ہوا اور وہ بھی اور تیز ہوئے۔ مجبور ہوکر میں
بھاگا تو وہ بھی بھاگے۔ اب میں بے تحاشا بھاگ رہا تھا کہ
مجھ کو سر پیر کی خبر نہ تھی۔ نظر کم زور ہونے کی وجہ سے عینک
لگاتا تھا۔ بغیر عینک راہ دھندلی نظر آرہی تھی اور پھر اندھیرا
ہو رہا تھا۔ مگر جناب، جس کے پیچھے کتّے لگے ہوں وہ کھائی
خندق کچھ نہیں دیکھتا۔ کتّوں سے بچنے کے لئے میں نے جان توڑ
کوشش کی اور پھاٹک کی راہ چھوڑ کر ایک طرف احاطہ کی دیوار
نیچی دیکھ کر اُس طرف بھاگا۔ کتّے کم بخت اب بھاگ ہی نہیں
رہے تھے بلکہ بھونک بھی رہے تھے۔ نرم نرم کوڑے کے انبار
پر میں تیزی سے چڑھا اور اپنی جان سے ہاتھ دھو کر ایسا
بے تحاشہ بھاگا کہ دیوار کو بغیر دیکھے پھاند گیا۔ گھوڑے اور
کوڑے پر سے لڑھکتا ہوا کوئی پندرہ فیٹ کی گہرائی میں گرا۔
بوکھلا کر گرا اور اٹھا (اٹھا اور گرا)۔ ایک نظر دیکھا تو کتّے
اوپر ہی رُک گئے ہیں اور پھر وہاں سے بھاگا اور نہ معلوم
کس طرح جان بچا کر کہیں بھاگا کہ سڑک پر آکر دم لیا۔ سارا

بدن اور کپڑے کوڑے میں اَٹ گئے تھے۔ پتلون کا ستیاناس ہو گیا تھا۔ جھاڑتا پونچھتا گھر پہنچا۔

وہ دن اور آج کا دن، میں نے قسم کھائی ہے کہ خواہ مخواہ کوئی کچھ ہی کہے؛ میں باتیں اور وہ بھی فضول باتیں کرنے سے باز نہ رہوں گا اور اگر ذرا بھی کسی کو خاموش پاتا ہوں تو اس کو بولنے پر مجبور کرتا ہوں اور اپنے سوالوں کا جواب تو ضرور ہی لیتا ہوں۔

جلاوطن

سندر لالہ۔ بجے دُلالہ۔ ناچے سری ہری کیرتن میں۔

ناچے سری ہری کیرتن میں۔

ناچے

چوکھٹ پر اُکڑو بیٹھی رام رکھی نہایت انہماک سے چاول صاف کر رہی تھی۔ اس کے گانے کی آواز دیر تک نیچے گوُ والی سنسان گلی میں گونجا کی۔ پھر ڈاکٹر آفتاب رائے صدر اعلیٰ کے چبوترے کی اور سے بڑے پھاٹک کی سمت آتے دکھلائی پڑے۔

"بندگی بھیّن صاحب ——" رام رکھی نے گھونگھٹ اور زیادہ طویل کرکے آواز لگائی

"بندگی —— بندگی ——" ڈاکٹر آفتاب رائے نے زینے پر پہنچتے ہوئے بے خیالی سے جواب دیا۔

"راجی کھسی ہو بھیّن صاحب ——" رام رکھی نے اخلاقاً دریافت کیا

"اور کیا —— مجھے کیا ہوا ہے جو راضی خوشی نہ ہوں گا۔ یہ سُوپ

ہٹا نپج ہیں سے" انہوں نے جھنجلا کر کہا۔

"بھین صاحب ناچ پھنک رہی تھی"

"تو ناچ پھنکنے کے لئے تجھے گارڈی بھر راستہ چاہیئے۔ چل ہٹا سب چیز ــــــــ"

ڈاکٹر آفتاب رائے نے دنیا بھرے کی ڈگریاں توڑ ڈالی تھیں۔ لیکن حالت یہ تھی کہ ذری ذری سی بات پر بچوں کی طرح خفا ہو جایا کرتے تھے۔ رام رکھی پر برستے ہوئے وہ اوپر آئے اور مونڈھے پر پیر ٹکا کر انہوں نے اپنی بہن کو آواز دی ــــــ بیجی ــــــ جی ای ای ــــ جی ای ی ی ــــــ (چھو رہا ہے اب تلک مورا بھیں ــــــ ہیم کرن پیار سے کہا کرتیں) دالان کے آگے کھلی چھت پر نیم کی ڈالیاں منڈیر پر جھکی پچھوا ہوا میں سرسرا رہی تھیں۔ شام کی گہری کیفیت موسم کی اُداسی کے ساتھ ساتھ سارے میں بکھری تھی۔ دن بھر نیچے مہوا کے باغ میں شہد کی مکھیاں بھنبھنایا کرتیں۔ اور ہر چیز پر غنودگی ایسی چھائی رہتی۔ آم اب پیلے ہو چلے تھے "ٹھکرائن کی بگیا" میں صبح سے لے رات گئے تک روں روں کرتا رہٹ چلا کرتا۔

"آوت ہیں بھین صاحب ــــ" ہیم کرن نے دالان کا پیتل کا نقش و نگار والا کواڑ کھولتے ہوئے غلہ کے گودام میں سے باہر آ کر جواب دیا۔ اور گیہوں کا گچھا ساری کے پلّوں میں باندھ کر چھن سے پشت پر پھینکتی ہوئی صحنچی میں آ گئیں۔

"جے رام جی کی بھیّن صاحب ـــــ" رسوئیے نے چوکے میں سے آواز لگائی ـــــ "کٹہل کی ترکاری کھیّو بھیّن صاحب ـــــ؟"

"ہاں۔ ہاں۔ ضرور کھیبا بھابی ـــــ" ڈاکٹر آفتاب رائے مونڈھے پر سے ہٹ کر ٹہلتے ہوئے تلسی کے چبوترے کے پاس آگئے۔ صحنچی میں رنگ برنگی مورتیاں الگ رام سے لے کر بجرنگ بلی مہراج تک سیندور سے لپی پتی اور گنگا جل سے نہائی دھوئی قرینے سے سجی تھیں۔ ہیم کرن تھیں تو بڑی سخت رام بھگت لیکن باقی کے سبھی دیوی دیوتاؤں سے سمجھوتہ رکھتی تھیں کہ نہ جانے کون کس سمے آڑے آجائے۔ سب سے بنائے رکھنی چاہیے۔ ابھی سرین رماکانت کھیل کے میدان سے لوٹیں گے۔ آٹھ بجے کھیما کتھک کے توڑے سیکھ کر جمنا مہراج کے ہاں سے واپس آئیگی پھر چوکے میں کھانا پروسا جائیگا۔ (پیتل کے برتن ٹھنڈی چاندنی میں جھلملائیں گے۔ نیچے آنگن میں رام رکھی کوئی کجری شروع کر دے گی) یہاں پر بالآخر امن تھا۔ اور سکون۔

اب کھیم نیچے پکّے گلیارے میں سے چلتی ہوئی اوپر آرہی تھی۔ (ٹھکرائن کی بگیا میں سے ابھی اس نے کرونڈے اور کمرکھیں اور مکوہ توڑ کر جلدی جلدی منہ میں ٹھونسے تھے۔ دھاکر دادھی ناکت تا ـــــ دھاکر دا ـــــ ارے باپ رے۔ اس نے منڈیر پر سے اوپر جھانک کر دمینتی سے کہا ـــــ ماما آئے ہیں۔ بھاگ جا ورنہ تجھے ماریں گے کہ ہر سمے کھیلتی ہے ـــــ دمینتی بھاگ گئی)

کھیم چھت پر آئی۔ لمبے سے ڈھیلے ڈھالے فراک میں ملبوس، جس پر موتیوں سے خوب تتلیاں اور پھول پتے بنے تھے، خوب کھینچ کر بالوں کی مینڈھیاں گوندھے، ہاتھوں میں چھنا چھن چوڑیاں بجاتی کھیم دتی رائے زادہ اپنے اتنے پیارے اور اتنے سندر ماما کو دیکھ کر بیحد خوش ہوئی۔

"نمستے ماما —— ابھی کتاب لاتی ہوں بس ذرا منہ ہاتھ دھو آؤں۔"

"چل چڑیل —— بہانے باز —— سبق سُنا پہلے —— ڈاکٹر آفتاب رائے نے پیار سے کہا (لیکن یہ کچھ تجربہ انھیں تھا کہ اپنے سے کم عمر لوگوں سے اور کنبے برادری والوں سے یہ گھر گرہستی اور لاڈ پیار کے مکالمے وہ زیادہ کامیابی سے ادا نہ کر پاتے تھے)

"تجھے تو میں انٹرمیڈیٹ میں بھی حساب دلاؤں گا۔ دیکھتی جا ——" (انہوں نے پھر ماما بننے کی سعی کی)

"ارے باپ رے —— !!" کھیم نے مصنوعی خوف کا اظہار کیا۔

"اور تو نے چوڑیاں تو بڑی خوبصورت خریدی ہیں ری ——"

"ہی ہی ہی —— ہاہا ——" کھیم نے دلی مسرت سے اپنی چوڑیوں کو دیکھا۔

"اور تو ساری بھی تو پہنا کر، کہ فراک ہی پہنے پھرے گی —— باولی سی ——" (انہوں نے اپنی بزرگی کا احساس خود اپنی اوپر طاری کرنا چاہا)

جی ماما ـــ ہیم کے ذہن میں وہ ساریاں چھما چھم کرتی کوند گئیں۔ جو ماں کے صندوقوں میں ٹھنسی تھیں۔ وہ تو خدا سے چاہتی تھی کہ کل پہنتی آج ہی وہ ساریاں پہن ڈالے، مگر ہیم کرن ہی پر انگریزیت سوار تھی۔ ایک تو وہ یہ نہیں بھولی تھیں کہ تھیں تو وہ جونپور کے اس ٹھیٹھ، دقیانوسی سریواستوا گھرانے کی بٹیا ـــ پر ان کا بیاہ ہوا تھا الہ آباد کے اپنے فیشن ایبل کنبے میں جس کے سارے افراد سول لائنز میں رہتے تھے۔ اور جوتے پہنے پہنے کھانا کھاتے تھے اور مسلمانوں کے ساتھ بیٹھ کر چائے پانی پیتے تھے۔ اور کو دھوا ہوئے ان کو اب سات برس ہوتے آئے تھے اور تب سے وہ میکے ہی میں رہتی تھیں۔ لیکن محلے پر ان کا رعب تھا کیونکہ وہ الہ آباد کے رائے زادوں کی بہو تھیں ـــ دوسرے یہ کہ فراک کا فیشن ڈاکٹر سین کے یہاں سے چلا تھا ڈاکٹر ایس گپتا ضلع کے سول ہسپتال کے اسسٹنٹ سرجن تھے اور ہسپتال سے ملحق ان کے پیلے رنگ کے اُجاڑ سے مکان کے سامنے ان کی پانچوں بیٹیاں رنگ برنگے فراک پہنے دن بھر ادھم مچایا کرتیں۔ شام ہوتی تو آگے آگے ڈاکٹر سین گپتا دھوتی کا پلّا نہایت نفاست سے ایک انگل میں سنبھالے، ذرا پیچھے اُن کی بی بی سُرخ کنارے والی سفید ساری پہنے، پھر پانچوں کی پانچوں لڑکیاں سیدھے سیدھے بال کندھوں پر بکھرائے چلی جا رہی ہیں۔ ہوا خوری کرنے۔ اُفوہ۔ کیا ٹھکانہ تھا بھلا۔ بس ہر بنگالی گھرانے میں یہ لڑکیوں کی فوج دیکھ لو۔

ہیم کرن کو ڈاکٹر سین گپتا سے بڑی ہمدردی تھی۔ کھیم کی ان سب سے بہت گھٹتی تھی۔ خصوصاً مونتر برا سے۔ اور اسکول کے ڈرامے کے دنوں میں تو بس کھیم اور مونتیرا ہی سب پر چھائی رہتیں۔ کیا کیا ڈرامے مہادیوی کنیا پاٹھ شالہ نے نہ کر ڈالے ــــــ "نل دمینتی" ــــــ اور "شکنتلا ہریش چندر" اور "راج رانی میرا ــــ اور اوپر سے ڈانس الگ ــــ گربا بھی ہو رہا ہے کہ آ تیرے گنگا پار تیرے جمنا بیچ میں ٹھاڑے ہیں نندلال ـــ اور آپ کا خدا بھلا کرے رادھا کرشنا ڈانس بھی لیجئے کہ میں تو گردھر آگے ناچوں گی ــــ جی ہاں۔ اور وہ گگری والا ناچ بھی موجود ہے کہ چلو چلو سکھی سکھیاری ری چلو پنگھٹ بھر دا پانی ــــــ اور ساتھ مونتیرا سین گپتا ہے کہ فراٹے سے ہارمونیم بجا رہی ہے۔

ایسے ہونے کو مسلمانوں کا بھی ایک اسکول تھا۔ انجمن اسلام گرلز اسکول ــــ وہاں یہ سب ٹھاٹھ کہاں۔ بس بارہ وفات کی بارہ وفات میلاد شریف ہو جایا کرتا اور اس میں کھڑے ہو کر لڑکیوں نے خاصی بے سری آواز میں پڑھ دیا۔

تم ہی فخر انبیا ہو۔ یا نبی سلام علیکا ــــ چلئے قصہ ختم۔ ایک مرتبہ ایک سرپھری ہیڈ مسٹرس نے جو نئی نئی لکھنؤ سے آئی تھی "روپ متی باز بہادر" خواتین کے سالانہ جلسے میں اسٹیج کروا دیا تو جناب عالی لوگوں نے اسکول کے پھاٹک پر پکٹنگ کر ڈالی ــــ اور روزنامہ صدائے حق

نے پہلے صفحے پر جلی حروف میں شایع کیا:۔

ملت اسلامیہ کی غیرت کا جنازہ ———

گرلز اسٹیج کے اسٹیج پر نکل گیا۔

مسلمانو! تم کو خدا کے آگے بھی جواب دینا ہوگا ——— بنات اسلام

کو رقص و سرود کی تعلیم ——— اسکول کو بند کرو ———

(یہ سب قصے کھیم کی مسلمان سہیلی کشوری اسے سنایا کرتی تھی جو پڑوس میں رہتی تھی۔ صدر اعلیٰ کے چبوترے کے آگے والے مکان میں۔ وہ اسلامیہ گرلز اسکول میں پڑھتی تھی۔ اس کا بڑا بھائی اصغر عباس، سرین اور رما کانت کے ساتھ ہاکی کھیلنے آیا کرتا تھا۔ ویسے پڑھے وہ لوگ بھی الگ الگ تھے۔ سرین اور رما کانت ڈی اے وی کالج میں تھے۔ اصغر عباس فیض اسلام کنگ جارج انٹر کالج میں۔

"کیوں ری ——— ایف اے کرنے کہاں جائے گی۔ جولائی آرہی ہے۔ بنارس جائے گی یا لکھنؤ ———؟" ڈاکٹر آفتاب رائے نے چوکے میں بیٹھے ہوئے سوال کیا۔

اب یہ ایک ایسا ٹیڑھا سوال اچانک سوال تھا جس کا جواب دینے کے لئے کھیم وتی ہرگز تیار نہ تھی۔ دونوں جگہوں سے متعلق اسے کافی انفرمیشن حاصل تھی۔ لیکن دو ٹوک فیصلہ وہ فی الحال کسی ایک کے حق میں نہ کر سکتی تھی۔ بنارس میں ایک تو یہ کہ چوڑیاں بہت عمدہ ملتی تھیں۔ لیکن لکھنؤ کو بھی بہت سی باتوں میں فوقیت حاصل تھی۔ مثلاً سینما تھے۔ اور دس

سینماؤں کا ایک سینما تو خود مہیلا وڈیالہ تھا۔ جہاں اُسے بھیجے کا تذکرہ ماما نے کیا تھا۔ پر وہ غالباً اسے بہر صورت ہر جگہ کرنا تھا۔ تانگے پر پردہ یہاں بھی ہیم کرن اپنے اور اس کے لئے بندھواتی تھیں۔ اور ماما جو اتنا بڑا ڈنڈا لئے سر پر موجود تھے۔

یہ ماما اس کے آج تک پلّے نہ پڑے تھے ولایت سے اَن گنت ڈگریاں لے آئے تھے۔ یونیورسیٹی میں پروفیسری کرتے تھے۔ تاریخ پر کتابیں لکھتے تھے۔ فارسی میں شعر کہتے تھے۔ بچوں بچوں کے مربی تھے کھیم کے ماما۔

رہے رما کانت اور سرین۔ تو رما کانت تو شاعر آدمی تھا۔ سارے مقامی شاعروں میں جاکر دو غزلے سہ غزلے پڑھ ڈالتا۔ اور حضرت ناشاد جونپوری کے نام نامی سے یاد کیا جاتا۔ سرین اسکے برعکس بالکل انجینئر تھا۔ اس سال وہ انٹر کرکے بنارس انجینئرنگ کالج چلا جائیگا۔ باقی کے سارے کنبے برادری کے بہن بھائی یونہی بکواس تھے۔ اس سلسلے میں اس کی گوئیاں کشوری یعنی کشور آرا بیگم کے بڑے ٹھاٹھ تھے۔ اس کے بیشمار رشتے کے بھائی تھے اور سب ایک سے ایک سورما۔۔ یہاں کسی کے سورما پنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ کسی نے آج تک اس سے یہ نہ کہا کہ چل کھیم تجھے سرکس یا نوٹنکی ہی دکھلا لاویں —— (نوٹنکی کے دنوں میں رسو یا تک ٹہک ٹہک کر گاتا —— اب یہی ہے مین نے ٹھانی —— لاؤں گا نوٹنکی رانی ——) کہاں کشوری کے ماجد بھائی ہیں تو لکھنؤ سے چوڑیاں

لے چلے آتے ہیں۔ اکرام بھائی ہیں تو کشوری ان کے لئے جھپا جھپ پل اوور بُن رہی ہے۔ اشفاق بھائی ہیں تو کشوری کو بیٹھے انگریزی شاعری پڑھا رہے ہیں۔ ان بھائیوں اور کھیم کے بھائیوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ کہاں کی چوڑیاں اور پل اوور۔ یہاں تو جوتیوں میں دال بٹتی تھی۔

ہیم کرن کو گھر کے کام دھندوں سے فرصت ملتی ۔ آفتاب رائے انکے لئے بڑا سہارا تھے۔ وہ ہر تیسرے چوتھے مہینے لکھنؤ سے آکر مل جاتے۔ رہنے والے ان کے بھیّن صاحب جونپور ہی کے تھے۔ پر یہاں اُن کی کسی سے ملاقات نہ تھی۔ "ضلع کے رؤسا اور مقامی عمائدین شہر" میں ان کا شمار تھا۔ پر آپ کا خیال اگر یہ ہے کہ ڈاکٹر آفتاب رائے جونپور کے اُن معززین کے ساتھ اپنا وقت خراب کریں گے تو آپ غلطی پر ہیں۔ حُکام سے اُن کی کبھی نہ بنی۔ انٹیلیکچوئل آدمی تھے۔ ان سول سروس اور پولس والوں سے کیا دماغ سوزی کرتے۔ جگن ناتھ جین آئی سی ایس جب نیا نیا حاکم ضلع ہو کر آیا تو اس نے کئی بار ان کو کلب میں بلا بھیجا۔ پر یہ ہرگز نہ گئے۔ رئیس الدین کاظمی ڈسٹرکٹ اینڈ سشن جج نے دعوت کی اس میں بھی نہ پہنچے۔ اور تو اور ولایت واپس جاتے وقت مسٹر چارلس مارٹن نے کوئین وکٹوریہ گورنمنٹ انٹر کالج کی پرنسپل شپ پیش کی۔ لیکن کھیم کے ماما نے اُسے بھی رد کر دیا۔ یوں تو خیر کانگریسی دکا نگریسی ہونا

کوئی خاص بات نہیں ۔ شہر اور قصبہ جات کا ہر ہندو جو سرکاری ملازم نہ تھا، گھر پر ترنگا لگاتا تھا ۔ اور ہر مسلمان کے اپنے وسیوں مشغلے تھے ۔ احرار پارٹی تھی ۔ شیعہ کانفرنس تھی ۔ ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی میں مسلمان بھرے ہوئے تھے ۔ مسلم لیگ کا تو خیر اس وقت کسی نے نام بھی نہ سنا تھا ۔ پر بہت سے مسلمان اگر انصاف کی پوچھئے تو کچھ بھی نہ تھے یا تو شاعری کرتے تھے یا مجلسیں پڑھتے تھے ۔

تو کہنے کا مطلب یہ کہ کوئی ایسی تشویشناک بات نہ تھی ۔ پر ڈاکٹر آفتاب رائے کی زیادہ تر لوگوں سے نہ پٹی ۔ ارے صاحب یہاں تک سنا گیا ہے کہ تری پورہ کانگریس کے موقع پر انہوں نے سب کو کھری کھری سنا دی ۔ گو یہ راوی کو یاد نہیں کہ انہوں نے کیا کہا تھا ۔

ضلع کی سوسائیٹی جن عناصر پر مشتمل تھی، انہیں سے ڈاکٹر آفتاب رائے کوسوں بھاگتے تھے ۔ وسط شہر میں مہاجنوں، ساہوکاروں اور زمینداروں کی اونچی حویلیاں تھیں ۔ یہ لوگ سرکاری فنڈ میں ہزاروں روپیہ چندہ دیتے ۔ اسکول کھلواتے، مجرے اور مشاعرے اور دنگل کرواتے ۔ جلسے جلوس اور سر پھٹول بھی ان ہی کے زیر سرپرستی منعقد ہوتے ۔ ہندو مسلمانوں کا معاشرہ بالکل ایک تھا ۔ وہی تیج تہوار میلے ٹھیلے، محرم، بالے میاں کی برات ۔ پھر

اُس سے اونچی سطح پر وہی مقدمے بازیاں۔ موکل۔ گواہ۔ پیشکار، سمن۔ عدالتیں۔ صاحب لوگوں کے لئے ڈالیاں۔

شہر کے باہر ضلع کا ہسپتال تھا۔ لق و دق ہری گھاس کے میدانوں میں بکھری ہوئی اداس پیلے رنگ کی عمارتیں۔ کچے احاطے۔ نیم کے درختوں کی چھاؤں میں آوٹ ڈور، مریضوں کے ہجوم۔ گرد آلود یکوں کے اڈے۔ سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے دو دو آنے میں خط لکھ کر دینے والے بہت بوڑھے اور شکستہ حال منشی، جو دھاگوں والی عینکیں لگائے دھندلی آنکھوں سے راہگیروں کو دیکھتے۔ پھر گلیاں تھیں جنکے گٹوں کے فرش پر پانی بہتا تھا۔ سیاہی مائل دیواروں پر کوئلے سے اشتہار لکھے تھے ــــ حکیم مارکہ دھاگہ خریدیئے پری برانڈ بیڑی پیو۔ ایک پیسہ باپ سے لو ــــ چار جاکر ماں کو دو ــــ آگیا، آگیا، آگیا سال رواں کا سنسنی خیز فلم "ہری راجہ" آگیا جس میں مس مادھوری کام کرتی ہے ــــ

پھر سایہ دار سڑکوں کے پرے آم اور مولسری میں چھپی ہوئی حکام ضلع کی بڑی بڑی کوٹھیاں تھیں۔ انگریزی کلب تھا۔ جس میں بے اندازہ خنکی ہوتی۔ چپ چاپ اور سائے کی طرح چلتے ہوئے مودب اور شائستہ "بیرے" انگریز اور کالے صاحب لوگوں کے لئے ٹھنڈے پانی کی بوتلیں اور برف کی بالٹیاں لاکر گھاس پر رکھتے نیلے پردوں کی قناتیں کے پیچھے ٹینس کی گیندیں سبزے پر لڑھکتی رہتیں۔

(۲)

اور سول لائنز کی اس دُنیا میں اُوپر سے آئی کنول کماری جین جگن ناتھ جین آئی سی ایس کی بالوں کٹی بیوی جس نے لکھنؤ کے مشہور انگریزی کالج ازابلا تھوبرن میں پڑھا تھا۔ اور جو گیند بلا کھیلتی تھی، کلب میں بڑی چہل پہل ہو گئی ــــــ گنتی کی کل تین تو میمیں ہی تھیں کلب میں۔ کوئین وکٹوریہ گورنمنٹ انٹر کالج کے انگریز پرنسپل کی میم ایک۔ زنانہ ہسپتال کی بڑی ڈاکٹرنی میم مس مک کنزی دو۔ اور اے پی مشن گرلز ہائی اسکول کی بڑی اُستانی مس سالفرڈ جو چن چنیا میم کہلاتی تھی کہ نوکروں پر چلاتی بہت تھی۔ ان تین کے علاوہ ڈاکٹرنی میم کی چھوٹی بہن مس اوریو مک کنزی تھی۔ جو اپنی بہن سے ملنے نینی تال سے آئی ہوئی تھی اور ضلع کے غیر شادی شدہ حکام کے ساتھ ٹینس کھیلنا اس کا خاص مشغلہ تھا اور اس میں ایسا کچھ اس کا جی لگا تھا کہ اب واپس جانے کا نام نہ لیتی تھی۔ شام ہوتے ہی وہ کلب میں آن موجود ہوتی اور مسٹر سکسینہ اور وے مسٹر فرحت اور وے مسٹر پانڈے۔ سبھی تو اس کے چاروں طرف کھڑے دانت نکوسے ہنس رہے ہیں۔ اس ایک میانے بھاٹی لوگوں کو تگنی کا ناچ نچا رکھا تھا۔ باقیماندہ حضرات بھی کہتے تھے کہ میاں کیا مضائقہ ہے۔ جونپور ایسی ڈل جگہ پر مس لسر کنزی کا دم، وہی غنیمت جانو۔ اب غور کرنیکا

مقام ہے کہ مس شبیرہ حمایت علی جو دوسری لیڈی ڈاکٹر تھیں۔ ان کا تو نام سُنکر ہی جی بیٹھ جاتا تھا مگر وہ خود بچاری بڑی اسپورٹنگ آدمی تھیں۔ برابر جی داری سے ٹنس کھیلنے آیا کرتیں۔ لکھنؤ کے کنگ جارجز کی پڑھی ہوئی تھیں۔ لندن جا کر ایک ڈپلوما بھی مار لائی تھیں لیکن کیا مجال جو کبھی بد دماغی دکھلا جاویں۔ لوگ کہتے تھے صاحب بڑی شریف ڈاکٹرنی ہے۔ بالکل گائے سمجھئے۔ گائے۔ جی ہاں اب یہ دوسری بات ہے کہ آپ توقع کریں کہ ہر لیڈی ڈاکٹر افسانوں اور ناولوں کی روایت کے مطابق بالکل حور شمائل، مہ وش، پری پیکر ہو۔ اچھی آدمی کا بچہ تھیں۔ بلکہ ایک مرتبہ تو ڈسٹرکٹ جج مسٹر کاظمی کی بیگم صاحب نے مسٹر فرحت علی سے تجویز بھی کی تھی کہ بھیا آزادی کا زمانہ ہے مس شبیرہ ہی سے بیاہ کر لو۔ جو یہ سال کے سال چھٹیوں میں تمہاری اماں تمہیں لڑکیاں دیکھنے کے لئے نینی تال، مسوری بھیجا کرتی ہیں، اس دردِ سر سے بھی نجات ملے گی اور کیا۔

راوی کہتا ہے کہ فرحت علی نے جو ان دنوں بڑے معرکے کا سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا۔ بیگم کاظمی کے سامنے کان پکڑ کر اٹھک بیٹھک کی تھی اور تھر تھر کانپا تھا۔ اور دست بستہ یوں گویا ہوا تھا کہ آئندہ وہ مس شبیرہ حمایت سے جو گفتگو کرے گی۔ وہ صرف چار جملوں پر مشتمل ہو گی ______ آداب عرض۔ آپ اچھی طرح سے ہیں؟ جی ہاں میں بالکل اچھی طرح ہوں۔ شکریہ۔ آداب عرض۔

مصیبت یہ تھی کہ جہاں کسی شامت کے مارے نے کسی "غیر منسلک" خاتون محترم سے سوشل گفتگو کے دوران میں ان چار جملوں سے تجاوز کیا تو بس سمجھ لیجئے ایکٹوٹی ہو گئی۔

تو غرضیکہ راوی دریا کو یوں کوزے میں بند کرتا ہے کہ کنول کماری کے میاں کا تقرر اس جگہ پر ہوا۔ (انگریز حاکموں کی اصطلاح میں صوبے کا ضلع "اسٹیشن" کہلاتا تھا)

اور نئے حاکم ضلع کے اعزاز میں کنور نرنجن داس رئیس اعظم جونپور نے (کہ یہ مہاراجہ کا سارا ایک نام تھا) اپنے باغ میں بڑی دھوم کی دعوت کی۔ چبوترے پر زرتار شامیانے تانا گیا۔ رات گئے تک جلسہ رہا۔ بیبیوں کے لئے اندر علیحدہ دعوت تھی۔ مہرانیوں نے کیا کیا کھانے نہ بنائے۔ مسلمان مہمانوں کے لئے باؤلے ڈپٹیوں کے وہاں سے باورچی بلوائے گئے تھے (باؤلے ڈپٹیوں کا ایک خاندان تھا۔ جس میں عرصہ ہوا ایک ڈپٹی صاحب کا دماغ چل گیا تھا۔ اس کے بعد سے وہ پورا خاندان باؤلے ڈپٹیوں کا گھرانہ کہلاتا تھا۔ کہار آواز لگاتے، اجی باؤلے ڈپٹیوں کے ہاں سے سواریاں آئی ہیں اُتروا لو مہریوں سے کہا جاتا ارے باؤلے ڈپٹیوں کے ہاں نیوتہ دینے آنا رام دکھی جھاڑو پھیٹی)۔

ہیم کرن ایسے تو کہیں آتی جاتی نہ تھیں۔ پر رانی نرنجن داس کی زبردستی پر وہ بھی دعوت میں آ گئی تھیں۔ کلکٹر کی بیوی سے ملنے

کے لئے عمائدین شہر کی بیویوں نے کیا کیا جوڑے نہ پہنے تھے۔ لیکن جب خود کنول کماری کو دیکھا تو پتہ چلا کہ یہ تو پوری میم ہے۔ غضب خدا کا ہاتھوں میں چوڑیاں تک نہ تھیں۔ ناک کی کیل تو گئی چولہے بھاڑ میں ہلکے نیلے رنگ کی ساڑی سی پہنے گاؤ تکیے سے ذرا ہٹ کر بیٹھی وہ سب سے مسکرا مسکرا کر باتیں کرتی رہی۔

"اے لو بٹیا تم نے تو سہاگ کی نشانی ہی کو بھاڑو پیٹے فیشن کی بھینٹ کر دیا۔" صدر اعلیٰ کی بیگم نے ناک پر انگلی رکھ کر اس سے کہا۔

"اے ہاں سچ تو ہے۔ کیا ڈنڈا ایسے ہاتھ لئے بیٹھی ہو۔ دور پار چھائیں پھوئیں دیکھے ہی سے ہول آتا ہے۔ بیگم کاظمی نے بھی صاد کیا۔

کیسم کی تو بہرحال آج عید تھی۔ اس نے تیز جامنی رنگ کی بنارسی ساری باندھی تھی۔ پاؤں میں رام جھول پہنے تھے۔ سونے کی کردھنی اور دوسرے سارے گہنے پاتے علیحدہ کندن کا چھپکا، اور گر کشولہ بھی پہن آئی تھی۔ لیکن کشوری کی اماں (جو محلے میں بڑی بھاوج کے نام سے یاد کی جاتی تھیں۔) بن بیاہی لڑکیوں کے زیادہ سنگار پٹار کی قطعی قائل نہ تھیں۔ ان کے یہاں تو لڑکیاں باکیاں مانگ تک بالوں میں نہ کاڑھ سکتی تھیں۔ پر اب زمانے کی ہوا کے زیر اثر نئی پود کی لڑکیوں نے سیدھی اور آڑی مانگیں کاڑھنی شروع کر دی تھیں۔ کیسم دور سے بیٹھی کنول کماری کو دیکھتی رہی۔ کتنی سندر

ہے اور پھر ایم' اے پاس۔ ایم اے پاس لڑکی کھیم اور کشوری کی نظروں میں بالکل دیوی دیوتا کا درجہ رکھتی تھی۔

کنول کماری جین ساری کی مہمان بیبیوں سے ہنس ہنس کر سخت خوش اخلاقی سے گفتگو کرنے میں مصروف تھی (اور ساری حاضرات محفل نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ لڑکی سابق کلکٹر کی بیوی اس چڑیل مسز بھارگو سے کہیں زیادہ اچھی اور ملنسار ہے رانی بٹیا ہے بالکل)

دالان کے گملوں کی اوٹ میں کھیم اور کشوری بیٹھی تھیں۔ اور منٹ منٹ پر ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہوئی جا رہی تھیں۔ اب ایک بات ہو تو بتلائی جائے۔ دسیوں تھیں۔ مثلاً موٹی مصرانی کی چال ہی دیکھ لو۔ اور ادپر سے کنور نرنجن داس صاحب تعلقہ کی اسٹیٹ کی مینجر صاحب لالہ گنپتی مہلشے بار بار ڈیوڑھی پر آن کر للکارتے —— "اجی پردہ کر لو کہار اندر آ رہے ہیں" تو ان کے حلق میں ایسی آواز نکلتی جیسے ہارمونیم کے پردوں کو برساتی ہوا مار گئی ہو۔

اسی کے بعد جب ماما لکھنؤ سے گھر آئے تو کھیم نے دعوت کی ساری داستان ان کے گوش گزار کر دی۔ کنول کماری ایسی۔ اور کنول کماری ویسی ماما چپکے بیٹھے سنتے رہے

(۳)

کھیم جب رات کا کھانا کھا کر سونے چلی گئی۔ اور سارے گھر

میں خاموشی چھا گئی تو ڈاکٹر آفتاب رائے چھت کی منڈیر پر آکر کھڑے ہو گئے۔ باغ اب سنسان پڑے تھے۔ گرمیوں کا موسم نکلتا جا رہا تھا۔ اور گلابی جاڑے شروع ہو گئے تھے۔ پروائی ہوا آہستہ آہستہ بہہ رہی تھی۔ نیچے ٹھکرائن کی بگیا والی گلی کے برابر سے مسلمانوں کا محلّہ شروع ہوتا تھا۔ اس کے بعد بازار تھا۔ جس میں مدھم گیس اور لالٹین کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ پھر پولیس لائنز کے میدان تھے۔ اس کے بعد کچہری اور سول لائینز۔

سول لائینز میں حاکم ضلع کی بڑی کوٹھی تھی۔ جس پر یونین جیک جھٹ پٹے کی نیم تاریکی میں بڑے سکون سے لہرا رہا تھا۔ سارے میں یہ تھکی ہوئی خاموشی چھائی تھی۔ سامنے سلطان حسین شرقی کے زمانے کے اونچے پھاٹک اور مسجدوں کے بلند مینارات کے آسمان کے نیچے سات سو سال سے اسی طرح ساکت و صامت کھڑے تھے۔ زندگی میں بے کیفی تھی، اور اُداسی۔ اور ذلت تھی اور شدید غلامی کا احساس تھا۔

عمر بھر آفتاب رائے نے یونہی سوچا تھا کہ اب وہ اور کچھ نہ کریں گے۔ لیکن دُنیا موجود تھی۔ وہ کام بھی کرتے۔ کھانا بھی کھاتے سال میں چار دفعہ جون پور آکر جی جی سے دماغ سوزی بھی کرتے۔ زندگی کے بھاری پن کے باوجود گاڑی تھی کہ چلی جا رہی تھی۔

کنول کماری اس منظر کے پرے مولسری کے جھنڈ کے دوسری

صرف یونین جیک کے سائے میں برا جتی تھی۔ بہت سے لوگ ہیں کہ جو راستہ سوچا اختیار کر لیا۔ آرام سے اس پر چلتے چلے گئے۔ یہاں کسی راستے کا تعین ہی نہ ہو پاتا تھا۔ ایک کے بعد ایک سب ادھر نکل گئے تھے۔ آفتاب رائے وہیں کے وہیں تھے۔

کنول کماری ——— لاحول ولا قوۃ۔

جب وہ یونیورسیٹی سے ڈاکٹریٹ کے لئے ولایت جا رہے تھے تو کنول نے اُن سے کہا تھا "آفتاب بہادر تم کو اپنے اُوپر بڑا مان ہے۔ پر وہ مان ایک روز ٹوٹ جائے گا۔ جب میں بھی کہیں چلی جاؤں گی۔"

"تم کہاں چلی جاؤ گی؟"

"فوہ ——— لڑکیاں کہاں چلی جاتی ہیں ———؟!"

"گویا تمہارا مطلب ہے کہ تم بیاہ کر لوگی"؟

"میں خود تھوڑا ہی بیاہ کرتی پھروں گی۔ ارے عقلمند داس۔ میرا بیاہ کر دیا جائے گا۔" اس نے جھنجھلا کر جواب دیا تھا۔

"ارے جاؤ ——— آفتاب رائے خوب ہنسے تھے ———" میں اس پھانسے میں آنے والا نہیں ہوں۔ تم لڑکیوں کی پسند بھی کیا شے ہے۔ تم جیسی موڈرن لڑکیاں آخر میں پسند اسی کو کرتی ہیں جو ان کے سماجی اور معاشی معیار پر پورا اترتا ہے، باقی سب بکواس ہے۔ پسند اضافی چیز ہے تمہارے لئے ———"

"ہاں بالکل اضافی چیز ہے۔ آفتاب بہادر ـــــ" وہ غصّے کے مارے بالکل خاموش ہو گئی تھی۔

وہ چاند باغ میں تھی۔ آپ بادشاہ باغ میں بڑی دھوم دھام سے براجتے تھے۔ یونین کی پریذیڈنٹی کرتے تھے۔ تقریریں بگھارتے تھے۔ ایک منٹ نچلے نہ بیٹھتے تھے۔ تاکہ کنول نوٹس نہ بھی لینی ہے تو لے۔ وہ اے پی سین روڈ پر رہتی تھی اور سائیکل پر روز چاند باغ آیا کرتی تھی۔ لکھنؤ کی بڑی نمائش ہوئی تو وہ بھی اپنے کنبے کے ساتھ میوزک کانفرنس میں گئی۔ وہاں یونیورسٹی والوں نے سہگل کو اپنے محاصرے میں لے رکھا تھا۔ جس گانے کی یونیورسٹی اور چاند باغ کا مجمع فرمائش کرتا۔ وہی سہگل کو بار بار گانا پڑتا۔ بھائی آفتاب بھی شور مچانے میں پیش پیش لیکن اگلی صف میں کنول کو بیٹھا دیکھ کر فوراً اسٹ پٹا کر چپ ہو گئے اور سنجیدگی سے دوستوں سے بولے کہ یار چھوڑو کیا ہلڑ مچا رکھا ہے اس پر عزّت نے عسکری بلگرامی سے کہا (آج ان دونوں پیارے دوستوں کو مرے بھی اتنا عرصہ ہو گیا، تھا منڈیر پر کھڑے ہوئے آفتاب رائے کو خیال آیا) عزّت نے عسکری سے کہا۔ اُستاد یہ اپنا آفتاب جو ہے یہ اس لونڈیا پر اچھا امپریشن ڈالنے کی فکر میں غلطاں و پیچاں ہے۔ اب خداوند تعالیٰ ہی اس پر رحم کرے ـــــ

"بی، اے کے بعد تم کیا کرو گی ـــــ؟" ایک روز آفتاب رائے

نے کنول سے سوال کیا۔

"مجھے کچھ پتہ نہیں ——؟" کنول نے کہا تھا۔ اس میں گویا یہ اشارہ تھا کہ مجھے تو کچھ پتہ نہیں تم ہی کوئی پروگرام بتاؤ۔

لیکن کچھ عرصے بعد وہ سیدھے سیدھے ولایت نکل لئے۔ کیونکہ غالباً اُن کی زندگی کے لئے، اُن کے گھر والوں کے لئے، کنول کے وجود سے کہیں زیادہ اہم بھی۔ پھر اُن کی آئیڈیالوجی تھی۔ (یار کیا بکواس لگا رکھی ہے۔ عرت نے ڈپٹ کر کہا تھا)

پھر ایک روز لندن میں جب وہ سینٹ ہاؤس کی لائبریری سے گھر کی اور جا رہے تھے تو راہ میں انہیں ہیپل نظر آیا۔ جس نے دور سے آواز لگائی —— "چائے پینے چلو تو ایک واقعہ ذا جعہ گوش گذار کردوں کنول کماری کا جگن ناتھ چین سے بیاہ ہوگیا۔ دہی جون پینتیس کے پنچ کا ہے ——"

لڑکیوں کی عجیب بے ہودہ قوم ہے۔ اس روز آفتاب رائے اس نتیجے پر پہنچے "ان کو سمجھنا ہمارے تمہارے بس کا روگ نہیں۔ میاں وہ جو بڑی انٹلکچوئیل کی سانس بنی پھرتی تھی۔ ہوگئی ہوگی، اب گلیڈ —— جگن ناتھ چین ہائی فٹ —— کون تھا یہ اُلّو —— میں نے کبھی دیکھا ہے اسے۔؟" ہیپل کے کمرے میں پہنچ کر آتشدان سلگاتے ہوئے انہوں نے سوال کیا۔

مہیپل رائے زادہ کھڑکی میں جھکا باہر سڑک کو دیکھ رہا تھا۔ جہاں ٹھیلے والے کوئی دن بھر گلا پھاڑ چلاتے رہنے کے بعد اب اپنے اپنے ترکاریوں کے ٹھیلے کھسیٹتے ہوئے سر جھکائے آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ شام کا دھندلکا سارے میں بکھر گیا تھا زندگی بڑی اُداس ہے۔ اس نے خیال کیا تھا۔ ہاں۔ اس نے آفتاب رائے سے کہا تھا میں نے اسے پٹنے میں دیکھا تھا۔ کالا سا آدمی ہے۔ عینک لگاتا ہے کچھ کچھ لومڑی سے ملتی جلتی اس کی شکل ہے۔

"بیوقوف بھی ہے ——؟" آفتاب رائے نے پوچھا تھا۔

"خاصا بیوقوف ہے —— مہیپل رائے زادہ نے جواب دیا تھا۔

"—— پھر کنول اس کے ساتھ خوش کیسے رہ سکے گی؟" آفتاب رائے مہیپل سے مطالبہ کیا۔

"میاں آفتاب بہادر ——" مہیپل نے مڑ کر ان کو مخاطب کیا ——

"یہ جتنی لڑکیاں ہیں نا —— جو افلاطونِ زماں بنی پھرتی ہیں۔ یہ بیوقوفوں کے ساتھ ہی خوش رہتی ہیں، آیا عقل میں تمہاری ——؟"

"کیا بکواس ہے ——" آفتاب رائے نے بڑی آزردگی سے کہا۔

اب مہیپل رائے زادہ کو صریحاً غصّہ آگیا۔ اس نے جھنجھلا کر کہا تھا —— "تو میاں تم کو روکا کس نے تھا۔ اس سے بیاہ کرنے کو۔ جو اب مجھے بور کر رہے ہو۔ کیا وہ تم سے خود آکر کہتی کہ میاں آفتاب بہادر میں تم سے بیاہ کرنا چاہتی ہوں۔ ایں ——؟ اور فرض کرو اگر

وہ خود ہی ہی کر دیتی تو کیا قیامت آجاتی۔ میاں لڑکی تھی یا ہوّا۔ کیا مارتی تم کو جھاڑو لے کر ——— کیا کرتی ——— ؟ تم نے بیکن کہہ کے ہی نہیں دیکھا۔ خیر چلو ——— خیریت گزر گئی۔ اچھا ہی ہوا۔ کہاں کا جھگڑا مول لیتے بیکار میں۔ کیونکہ میرا مقولہ ہے۔ (اس نے انگلی اُٹھا کر عالمانہ انداز میں کہا) کہ شادی کے چار سال بعد سب شادیاں ایک سی ہو جاتی ہیں ——— تم کو تو جگن ناتھ جین کا شکر گزار ہونا چاہئے۔ کہ اس نے تم کو ایک بارِ عظیم سے سبکدوش کیا۔ بلکہ وہ تمہارے حق میں دافع بلیّات ثابت ہوا ———"

"بیہودہ ہیں آپ انتہا سے زیادہ ——— آفتاب رائے نے جھنجلا کر کہا تھا۔

لکھنؤ لوٹ کر ایک روز آفتاب رائے اتفاقاً اے۔ پی سین روڈ پر سے گزرے۔ سامنے کنول کے باپ کی سُرخ رنگ کی بڑی سی کوٹھی تھی۔ جس کی برساتی پر کاسنی پھولوں کی بیل پھیلی تھی۔ یہاں ایک زمانے میں کتنا اودھم مچتا۔ کنول کے سارے بہن بھائیوں نے مل کر اپنا آرکیسٹرا بنا رکھا تھا۔ کوئی بانسری بجاتا، کوئی جلترنگ۔ کنول طبلہ بجاتی ایک بھائی وائلن کا اُستاد تھا۔ سب مل کر جے جے ونتی شروع کر دیتے

مورے مندر اب لوں نہیں آئے ——— کیسی چوک بھئی موسے آئی ———

پھر ادچنا بزرجی آجاتی۔ اور کوئل ایسی آواز میں گاتی آمی پوہوڑی جھوڑ نا نگر بو بو تو ئے ——— بو تو ئے ہو ——— اتوار کو دن بھر ہیڈ منٹن

ہوتا۔ ہر سمے تو آفتاب رائے ان لوگوں کے یہاں موجود رہتے تھے۔ اور جب ایک روز خود ہی چپکے سے ولایت کھسک لئے تو ان لوگوں کا کیا قصور۔ وہ لڑکی کو بینک کے سیف ڈپازٹ میں تو ان کے خیال سے رکھنے سے رہے اور جگن ناتھ جین ایسا رشتہ تو بھائی قسمت والوں ہی کو ملتا ہے۔

پھر ایک روز امین آباد میں انہوں نے کنول کو دیکھا۔ وہ کار سے اُتر کر اپنی سسرال والوں کے ساتھ پارک کی مندر کے اور جا رہی تھی اور سُرخ ساری میں ملبوس تھی اور التا اس کے پیروں میں تھا (آلی ری ساری کے مندر دیا بار آؤں۔ کر آؤں سولہ سنگار ——— وہ گرمیوں کی شام تھی۔ امین آباد جگمگا رہا تھا۔ ہوا میں موتیا اور خس کی مہک تھی۔ اور مندر کا گھنٹہ یکسانیت سے بجے جا رہا تھا۔)

اب آفتاب رائے یونیورسٹی میں تاریخ کی چیئر سنبھالے ہوئے تھے۔ ساتھیوں کی محفل میں خوب اودھم مچاتے۔ ٹینس کھیلتے۔ اور صوفی ازم کی تاریخ پر ایک مقالہ لکھ رہے تھے۔ میں وہ نہیں ہوں۔ جو میں ہوں۔ میں وہ ہوں جو میں نہیں ہوں۔ ہر چیز باقی ساری چیزیں ہیں، بھگوان کرشن جب ارجن سے کہتے ہیں ——— او پرنس ارجنا ——— ("ارے جا ———" عسکری ڈانٹ بتاتا "اگر تم اس چکر میں ہو تم بھی پروفیسر ڈی پی مکرجی کی طرح مہاگرو بن کے بیٹھ جاؤ گے تو تم غلطی پر ہو۔ ڈاکٹر آفتاب

رلائے۔ تمہارا تو ہم مارتے مارتے حُلیہ ٹھیک کر دیں گے ——"
مہیپل اضافہ کرتا۔)
جونپور آکر وہ کھیم کو دیکھتے کہ تندہی سے کچالو کھا رہی ہے۔
کتھک سیکھ رہی ہے۔ جل بھرنے چلی رے گوئیاں آں آں گاتی پھر رہی
ہے۔ یہ بھی کنول کماری کی قوم سے ہے۔
"اری او باؤلی —— بتا تو کیا کرنیوالی ہے ——" وہ سوال کرتے۔
"پتہ نہیں ماما ——" وہ معصومیت سے جواب دیتی
پتہ نہیں کی بچی —— وہ دل میں کہتے

چھت کی منڈیر پر ٹہلتے ٹہلتے آفتاب رائے نیم کی ڈالیوں کے
نیچے آگئے۔ سامنے بہت دور، سول لائنز کے درختوں میں چھپی ہوئی
حاکم ضلع کی کوٹھی میں گیس کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ پروائی ہوا
بہے جا رہی تھی۔ یہ چاندرات تھی۔ اور مسلمانوں کے محلّوں کی طرف
سے محرّم کے نقّاروں کی آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئی تھیں۔
محرم آگیا —— آفتاب رائے کو خیال آیا —— شاید اب کے سے
پھر سر پھٹوّل ہو۔ بہت دنوں سے نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے سوچا۔
ویسے انگریز کی پالیسی یہ تھی کہ جن ضلعوں میں مسلمانوں کی اکثریت
تھی وہاں ہندو افسروں کو تعینات کیا جاتا تھا۔ اور جہاں ہندو زیادہ
ہوتے تھے وہاں مسلمان حاکموں کو بھیجا جاتا تھا تاکہ توازن قائم رہے۔

یہ دوسری بات تھی کہ صُوبے کی چھ کروڑ آبادی کا صرف ۱۳ فیصدی حصّہ مسلمان تھے۔ لیکن اتنی شدید اقلیت میں ہونے کے باوجود تہذیبی اور سماجی طور پر مسلمان ہی سارے صوبے پر چھائے ہوئے تھے۔ جونپور، لکھنؤ، آگرہ، علی گڑھ، بریلی، مرادآباد، شاہجہان پور، وغیرہ جیسے ضلعوں میں تو مسلمانوں کی دھاک بیٹھی ہو ہوئی تھی۔ لیکن باقی کے سارے خطّوں میں بھی ان کا بول بالا تھا۔ صوبے کی تہذیب، سے مراد وہ کلچر تھا جس پر مسلمانوں کا رنگ غالب تھا۔ گلی گلی محلے محلے گاؤں گاؤں سینکڑوں ہزاروں مسجدیں امام بارے تھے۔ مکتب مدرسے، درگاہیں قلعے، حویلیاں، چپے چپے سے مسلمانوں کی آٹھ سو سال پرانی روایات وابستہ تھیں۔ اور لطف یہ کہ مسلمان اب تک نہیں مرے تھے۔ بڑے زور و شور سے زندہ تھے۔

ہندو مسلمانوں میں سماجی سطح پہ کوئی واضح فرق نہ تھا۔ خصوصاً دیہاتوں اور قصبہ جات میں عورتیں زیادہ تر ساریاں اور ڈھیلے پاجامے پہنتیں۔ اودھ کے بہت سے پُرانے خاندانوں میں بیگمات اب تک ہنگے بھی پہنتیں۔ بن بیاہی لڑکیاں ہندو اور مسلمان دونوں ساری کے بجائے کھڑے پائنچوں کا پاجامہ پہنتیں۔ ہندوؤں کے ہاں اسے "اجلہ" کہا جاتا۔ مشغلوں کی تقسیم بڑی دلچسپ تھی۔ پولیس کا عملہ اسی فیصدی مسلمان تھا۔ محکمہ تعلیم میں ان کی اتنی ہی کمی تھی۔ تجارت تو خیر کبھی مسلمان بھائیوں نے ڈھنگ سے کرکے نہ دی۔ چند پیشے گر خاص مسلمانوں کے

جن کے دم سے صوبے کی مشہور صنعتیں قائم تھیں۔ لیکن خدا کے فضل و کرم سے کچھ ایسا معلوم نظام تھا کہ سارا منافع تو بازار میں پہنچتے پہنچتے پہنچاتے مڈل مین ہی مارے جاتا تھا اور جو بھائی کے پاس بچتا تھا۔ اس میں قرضے چکانے تھے۔ بٹیا کا جہیز بنانا تھا اور ہزاروں قصے تھے آپ جانئے۔

زبان اور محاورے ایک ہی تھے۔ مسلمان بچے برسات کی دعا مانگنے کے لئے منہ نیلا پیلا کئے گلی گلی ٹین بجاتے پھرتے اور چلاتے برسو رام دھڑا کے سے بڑھیا مرگئی فاقے سے۔ گڑیوں کی بارات نکلتی تو وظیفہ کیا جاتا —— ہاتھی گھوڑا پالکی —— جے کنہیا لال کی۔ ذہنی اور نفسیاتی پس منظر چونکہ یکساں تھا لہٰذا غیر شعوری طور پر IMAGERY بھی ایک ہی تھی۔ جس میں رادھا اور سیتا اور پنگھٹ کی گوپیوں کا عمل دخل تھا۔ مسلمان پردہ دار عورتیں جنہوں نے ساری عمر کسی ہندو سے بات نہ کی تھی۔ رات کو جب ڈھولک لے کر بیٹھتیں تو ہک ہک کر الاپتیں —— بھری گگری موری دھرکائی شام کرشن کنہیا کے اس تصور سے ان لوگوں کے اسلام پر کوئی حرف نہ آتا تھا۔ یہ سب چیزیں اس تمدن کی مظہر تھیں جنہیں پچھلی صدیوں میں مسلمانوں کی تہذیبی ہمہ گیری اور وسعتِ نظر اور ایک رچے ہوئے جمالیاتی حس نے جنم دیا تھا۔ یہ گیت اور کجریاں اور خیال، یہ محاورے یہ زبان، ان سب کی بڑی پیاری اور دل آویز مشترکہ میراث تھی۔

یہ معاشرہ جس کا دائرہ مرزاپور اور جونپور سے لے کر لکھنؤ اور دلی تک پھیلا ہوا تھا۔ ایک مکمل اور واضح تصویر تھا۔ جس میں آٹھ سو سال کے تہذیبی ارتقاء نے بڑے گمبھیر اور بڑے خوبصورت رنگ بھرے تھے۔

ڈاکٹر آفتاب رائے نے (کہ ان کا نام ہی اس مشترکہ تمدن کی لطافت کا مظہر تھا) ایک بار سوچا تھا کہ وہ کبھی ایک کتاب لکھیں گے کہ کس طرح پندرہویں صدی میں بھگتی تحریک کے ذریعے ایک خوبصورت مستقبل کی بنیاد رکھی جا رہی تھی۔ کس طرح نانک کا مذہب ہندوؤں کی فرقہ پرستی کے خلاف ایک پروگریسو ردِّ عمل ثابت ہو سکتا تھا۔ کس طرح انیسویں صدی کی وہابی تحریک کو غیر ملکی راج کے مقابلے میں ایک قومی محاذ بننے کے بجائے اس کا رخ دوسری طرف موڑ دیا گیا۔ آریہ سماجیوں اور فرقہ پرستوں کو کیسے شہ دی گئی۔ یہ اور اس طرح کی سو باتیں ان کے ذہن میں آتیں۔ لیکن ذہن ہی کو مکمل سکون کہاں میسر تھا۔ پہلے یہ کنول کماری گود پڑی۔ پھر ان کی معاشی مجبوریاں آڑے آئیں۔ اور ان کی ولایت سے لوٹ کر بنارس میں لکچر شپ سنبھالنی پڑی۔ جہاں دن رات ہندی اتھوا ہندوستانی کے گن گائے جاتے اور مالویہ جی کی تصویر کے آگے آرتی اُتاری جاتی ——— یہ میں تم سے کہتا ہوں ——— کہ شدھ ہندی اور گئو رکھشا، اور رام راجیہ یہ سب سے بڑا خطرہ ہے۔ اس خطرے

سے پوچھو۔ انہوں نے ایک دفعہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے پنڈال میں چلا کر کہا تھا ـــــ بھائی اگر یہی بات ہے تو سیدھے سیدھے مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے ـــــ ان سے کہا گیا ـــــ ہم تو ہندو پیدا ہوئے اور ہندو ہی مرینگے۔ تمہاری طرح سے تھوڑا ہی ہیں۔ ڈھلمل یقین ـــــ

آفتاب رائے کے ساتھی مذاق میں انھیں جونپور کا قاضی کہا کرتے "یہ جو کتاب تم لکھنے والے ہو اس کا نام رکھنا ـــــ "جونپور کا قاضی" ـــــ عرف "بیں شہر کے اندیشے میں دُبلا کیوں ہوا ـــــ!"

رات کی ہوا میں خنکی بڑھ چکی تھی۔ نیم کے پتے بڑے پُر اسرار طریقے سے سائیں سائیں کر رہے تھے۔ ہاں زندگی میں بے پایاں اُداسی تھی اور ویرانہ اور تاریکی۔

محلّے کے مکانوں میں مدھم روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ نیچے بڑی بھاوج کے مکان کے بڑے آنگن میں مجلس کے لئے جو گیس کا ہنڈہ نصب کیا گیا تھا اس کی روشنی رات کے اس ویرانے میں بڑی لرزہ خیز معلوم ہوتی تھی۔ جیسے مہوے کے جنگل میں اگیا بھتّال اور مسان چپکے چپکے رونے ہوں۔

مجلسوں کے گریہ و بکا کی مدھم آوازیں پروائی کے جھونکوں میں مل کر وقفے وقفے کے بعد یک لخت بلند ہو جاتی تھیں۔ نکڑ پر

کنور نرنجن داس کے ہاں کی محرم کی سبیل کے پاس رکھی ہوئی نوبت یکسانیت سے بجے جا رہی تھی۔

(۴)

"عاشور کی شب لیلیٰ ارے سرہانے شمع رکھ کر ـــــــ" بی مدّن نے تکیہ پر کرم خوردہ کتاب رکھ کر پڑھنا شروع کیا

"ـــــــ اے تکتی رہیں چہرہ علی اکبر کا ـــــــ" جگّن نے باریک تیز آواز میں ساتھ دینا شروع کیا۔

"اے لو دونوں کی دونوں سٹھیا گئی ہیں ـــــــ اے بیوی چاند رات کو نویں تاریخ کے مرثیے نکال بیٹھ گئیں ـــــــ!؟" بڑی بھاوج نے باورچی خانے سے پکارا۔

"توبہ توبہ۔ کمبخت ایسی ساڑستی پڑی ہے کہ اب تو کچھ بھی یاد نہیں رہتا ـــــــ اے لو میں تو عینک ہی لانا بھول گئی۔ اب مجھے کچھ سجھائی تھوڑی دے رہا تھا ـــــــ میں نے تو اٹکل سے پڑھنا شروع کر دیا

اے بہن ـــــــ اے نیازی بیگم ـــــــ ذرا اپنی عینک تو دینا ـــــــ" بوا مدّن نے طویل سانس بھر کے کہا

نیازی بیگم نے اپنی عینک اُتار کر دی جو بوا مدّن نے ناک کی پھننگ پر رکھ کر پھر سے بیاض کی ورق گردانی شروع کی۔

"اے بوا مدّن نجم اسلت کی بیاض بھی لائی ہو کہ نہیں ـــــــ؟" بڑی بھاوج نے تخت کے پائے کے قریب آ کر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔

"لڑکیوں سے پوچھے ——— بڑی بھاوج ——— نجم الملت کے توجے تو بھی لوگ پڑھتے ہیں ——— " بگن نے جواب دیا۔

"ہاں بٹیا ہم تو پرانے فیشن کے آدمی ہیں۔ اب تو نوجوں میں بھی نئے راگ رنگ نکلے ہیں ——— " بوا مدّن نے قدرے بے نیازی سے اضافہ کیا۔

یہ لڑکیوں پر صفا چوٹ تھی۔ بوا مدّن نے لڑکیوں کی نوحہ خوانی کو کبھی بھی بہ نظر استحسان نہ دیکھا تھا۔

کنبے اور محلّے کی ساری لڑکیاں دیواروں کے سہارے بڑے اسٹائل سے سیاہ جارجٹ کے دوپٹوں سے سر ڈھانپے خاموش بیٹھی تھیں۔ بوا مدّن کے اس طعنے کا انہوں نے ہرگز نوٹس نہیں لیا۔

"ڈولی اُتروالو ——— " باہر سے رام بھروسے کی آواز آئی۔

"پردہ کرلو لوگو ——— کہار اندر آتے ہیں ——— "

فیرینی کی سینی دھم سے گھڑونچی پر ٹکا کر ممولہ تیز آواز میں چلائی۔

"چھمّو بیگم آگئیں۔"

چھمّو بیگم ڈولی میں سے اُتریں۔ اور پائنچے سمیٹ کر پانی سے لبریز نالی کو الانگنے کے ارادے سے آگے بڑھیں۔ "اللہ رکھے بڑی بھاوج کے ہاں تو ہر وقت بس بہیا سی آئی رہتی ہے۔" انہوں نے ذرا بیزاری سے کہا۔

کہیں ممولہ نے یہ سُن لیا۔ "اے چھمّو بیگم ——— ذری زبان سنبھال

کے بات کیا کیجئے۔ بڑی بھاوج کے دشمنوں کے گھر بھیا آوے۔ شیطان
کے کان بھرے ـــــ ایسا تو میں نے آنگن کا سارا پانی سونتا ہے۔
اپنے ہاں نہیں دیکھتیں۔ ساری گلی کوچے کے نوبت رائے کا تلاؤ بنا رکھا
ہے۔ اِتا اِتا پانی آپ کے گھر میں کھڑا رہتا ہے۔ ہاں" اس نے مُنہ
در مُنہ جواب دیا۔

"اے بی مولہ ـــــ ذرا آپے میں رہنا ـــــ میں خود سے نہیں آگئی
بڑی بھاوج نے سو دفعہ بُلایا کہ آکر مجلس پڑھ جاؤ ـــــ مجلس پڑھ جاؤ
ـــــ میں اپنے گھر سے فالتو نہیں ہوں کہ ماری ماری پھروں اور ٹکے کی
ڈومنیوں کی باتیں سنوں۔ ہاں۔ لو بھائی ڈولی واپس کرو"
چھمو بیگم نے بیچ آنگن کے کھڑے ہو کر رجز پڑھا۔

بڑی بھاوج جلدی سے اُٹھ کر باہر آئیں ـــــ "اے ہے ـــــ یہ کیا
کوّا نوچن مچی ہے ـــــ اماموں پر مصیبت کی گھڑی آن پہنچی اور تم ہو
کہ کھڑی جھگڑ رہی ہو ـــــ چل نکل مولہ یہاں سے ـــــ ڈوبی جب دیکھو
تب یہی فضیحتہ شروع کرتی ہے ـــــ آؤ چھمو بیگم جم جم آؤ ـــــ"

ڈیوڑھی میں کہاروں نے زور سے ڈنڈا بجایا۔ اجی پیسے تو بھجوائیے
بیگم صاحب ـــــ

رارے دیّا رے ـــــ ساری دیہہ دکھن لاگت ہے ـــــ رام بھروسے
نے دیوار سے لگ کر ماتا دین کی بیڑی سلگاتے ہوئے اظہارِ خیال کیا۔ ویسے
محرّم کی وجہ سے اب پیسے خوب لیں گے۔ چہلم تک دس دس پھیرے ایک

گلی کے ہوتے تھے اور ہر پھیرا تین تین پیسے۔ دور کے محلوں تک آنے جانے کے تو دو دو آنے تک ہو جاتے تھے۔ بس چاندی تھی آج کل بھائی رام بھروسے اور ان کے برادری کی۔ اور ریڑھوے جو چل رہے تھے وہ الگ۔ ریڑھوہ ایک طرح کا لکڑی کا کرسی نما ٹھیلہ ہوتا تھا جس میں چاروں طرف پردہ باندھ دیا جاتا تھا۔ اندر دو دو تین تین سواریاں، گھُس پٹ کر بیٹھ جاتی تھیں اور بچوں کی انگریزی پرام کی طرح پیچھے سے دھکیلا جاتا تھا۔ اور چرخ چوں کرتا ریڑھوہ گلیوں کے پتھریلے فرش پر بڑے ٹھاٹھ سے چلتا۔ پالکی کا کرایہ بہت زیادہ تھا۔ یعنی چھ آنے فی پھیرا۔ پرائیوٹ پالکی جو پہلے صدر اعلیٰ کے یہاں تھا۔

چھمو بیگم اس معرکے کے بعد ٹھمک ٹھمک چلتی چلتی آن کر چاندنی پر بیٹھ گئیں۔ اور عینک لگا کر بڑے ٹھسّے سے چاروں طرف نظر ڈالی۔ بوا مدّن خود بڑی ہائی برو سوز خواں تھیں۔ انہوں نے کبھی چھمو بیگم کی پروا نہ کی۔

سوز ختم ہو چکا تھا۔ گوٹے کے پھُنکے لگاتی بوا مدّن طمانیت سے جاکر ایک کونے میں بیٹھ گئیں۔ چٹاپٹی کی گوٹ کا اودا پائجامہ اور طوطے کے پروں ایسے ہرے رنگ کا دوپٹہ اوڑھے وہ اس شان سے دیوار سے لگ کر بیٹھتی تھیں کہ دُور سے معلوم ہوتا تھا کہ۔ کہ ہاں یہ رام پور کی میراثن ہیں۔ مذاق نہیں ہے۔

چھمو بیگم ایک تو یہ کہ سیدانی تھیں۔ دوسرے یہ کہ جگن سلما کے بیاہ

کے سلسلے میں ان سے جنگ ہو چکی تھی لہٰذا وہ تو امدن کو ہرگز خاطر میں نہ لاتیں۔ اگرچہ تمدن کو اگر یہ زعم تھا کہ مالکوس اور سوہنی بہاگ میں وہ سوز ایسے پڑھتی ہیں کہ مجلس میں پٹس پڑ جاتی ہے۔ تو چھمّو بیگم کو بھی اپنے اوپر ناز بے جا نہ تھا کہ آٹھویں تاریخ والا میر انیس کا مرثیہ پوری راگ داری کے ساتھ ان جیسا کوئی اور نہ پڑھ سکتا تھا۔

چھمّو بیگم نے تہہ در تہہ ریشمی غلافوں میں سے چاند رات کا بیان نکالا اور مجمع کو نہایت گھور کے دیکھا۔

لڑکیوں کا گروہ اپنی جگہ پر ذرا چوکنّا ہو گیا۔ ان لڑکیوں پر فرض تھا کہ جب چھمّو بیگم حدیث پڑھیں یا وعظ کریں تو یہ لوگ دوپٹے منہ میں ٹھونس کر کھل کھل ہنسیں پر بظاہر یہی معلوم ہوتا کہ زار و قطار رو رہی ہیں۔ اور چھمّو بیگم کس قیامت کی حدیث پڑھتی تھیں کہ کہرام بپا ہو جاتا تھا۔

چھمّو بیگم کے وعظ بہت موڈرن ہوتے تھے۔ کیا جناب کین صاحب بلکہ خود قبلہ چار چوٹی صاحب ایسے ایسے رموز و نکات۔ انگریزی فلسفے کے واقعۂ شہادت میں سے نہ نکال سکے تھے۔ جو چھمّو بیگم پل کی پل دریا کو کوزے میں بند کر کے رکھ دیتیں۔

اے صاحبان مجلس ——— جب باری تعالیٰ نے اپنے نور کے دو حصے کیے ——— والی تمہید سے لے کر جب وہ اس کلائمکس تک پہنچتی تھیں کہ "اے بیبیو ——— جناب عباسؑ نے رو کر کہا بابی سکینہ اٹھو ے

تو اس وقت مجلس میں نالہ و شیون سے قیامت بپا ہو چکی ہوتی تھی۔ اندر باہر سب کہتے تھے کہ ماشاءاللہ سے چھمو بیگم نے سماں باندھ دیا۔ ان کے زور خطابت کا یہ عالم تھا کہ منٹوں میں بات کہیں سے کہیں پہنچتی تھی۔ ابھی حضرت جبرئیل علیہ السلام کا بیان ہو رہا ہے۔ ابھی یزید ملعون کے خاندان کا ذکر آ گیا۔ جنگ جمل کا واقعہ سُنا رہی ہیں ساتھ ساتھ اس کا موازنہ جرمن اور انگریز کی لڑائی سے بھی ہوتا جاتا ہے۔ رسالت مآبؐ کے بیان پر جب آتیں تو کہتیں ـــــ بیبیو ـــــ میں کوئی مورخ، کوئی تاریخ دان، کوئی فلاسفہ نہیں ہوں۔ مگر اتنا جانتی ہوں اور کہے دیتی ہوں کہ ایک طرف عیسائیوں اور رومیوں کی دس لاکھ فوج تھی۔ ایک طرف جناب رسالت مآبؐ کے ساتھ صرف پندرہ آدمی تھے۔ گروہ گھمسان کا دن پڑا تھا کہ سادے فرشتے چرخ اول پر اُتر آئے تھے اور نور کی جھاڑو سے رسالت مآبؐ کے لئے راستہ صاف کرتے جاتے تھے۔ خداوند تعالےٰ کے مسئلے پر فرماتیں ـــــ اے بیبیو ـــــ جو انگریزی داں دہریے خدا کے مُنکر ہیں۔ ان کا احوال مجھ سے سُنو۔ اور کان کھول کے سنو ـــــ کہ خداوند کریم ان سب شیطانی وسوسوں اور چالوں سے واقف ہے۔ جو فرنگیوں کے علم کے ذریعہ ابلیس ملعون نے تم مسلمانوں کے دلوں میں ڈال دی ہیں بلکہ میں تم کو یہ بتانا چاہتی ہوں اے مومنو بیبیو ـــــ کہ قرآن حکیم کے اندر اللہ تعالیٰ نے خود انگریزی میں اپنی توحید کا ثبوت دیا ہے۔ فرماتا ہے وہ رب ذوالجلال کہ قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ۔ اَللّٰہُ الصَّمَدُ۔ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ۔ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ،

کُفُوًا اَحَد ـــــــ یہ ون کیا ہے ـــــ ؟ ون انگریزی میں ایک کو کہتے ہیں ـــــ مسئلہ توحید سے سلسلہ کھینچ کر پھر واقعہ کربلا اور شہادت علی اکبر سے ملا دیا جاتا تھا۔ یہ چھمو بیگم کے آرٹ کا کمال تھا۔

بڑی بھاوج کیا سارے محلے کو معلوم تھا کہ چھمو بیگم خاصی فراڈ ہیں لیکن ان کی شمولیت کے بغیر مجلس میں جان ہی نہ پڑ سکتی تھی۔ لہذا ان کی بدمزاجی کو بھی برداشت کیا جاتا۔

برسوں سے، جب سے بڑی بھاوج پیدا ہوئیں، بڑی ہوئی، رخصت ہو کر بارہ بنکی سے جونپور آئیں۔ زندگی کا ایک چلن قائم تھا۔ جس میں شادی بیاہ، تیج تہوار، لڑائی جھگڑے، محرم، کونڈے جوگی رمپورے کی سالانہ زیارت، غرضکہ ہر چیز کی اہمیت اپنی جگہ مسلم تھی ڈپٹی جعفر عباس سے بڑی دھوم دھام سے ان کا بیاہ رچایا گیا تھا جب وہ پندرہ سال کی تھیں۔ کیا زمانے تھے۔ دو میل لمبا تو ماہی مراتب ہی تھا۔ براتیوں کو چاندی کی طشتریوں میں سندیلے کے لڈو بانٹے گئے تھے اور جناتیوں۔ یعنی لڑکی کے گاؤں والوں کے یہاں ہفتوں مہینوں پہلے ڈھولک رکھ دی گئی تھی۔ ان کا جبکہ سسرال دونوں طرف سے ماشاءاللہ سے بھرا پرا کنبہ تھا۔ بس ایک چھوٹی اماں ہی سے ان کی نہ بنی۔ دیورانی جٹھانی کا دیوار بیچ گھر تھا۔ لیکن مدتوں کھڑکی میں تالا پڑا رہا۔ مقدمہ کا قصہ دراصل امام باڑے والے آموں کے باغ سے چلا تھا۔ بعد میں رفتہ رفتہ دونوں بھائیوں کے گھرانوں میں بول چال تک بند ہو گئی۔

پیچ کہا ہے کہ بُوا کہ زر، زمین، زن، تینوں چیزیں گھر کا گھر دا کر دیتی ہیں۔ سگے بھائی غیر ہو جاتے ہیں۔ پر جب چھوٹی اماں بیمار پڑیں تو بڑی بھاوج نے وضعداری پر حرف نہ آنے دیا اور مرنے سے پہلے دیورانی نے ساری اگلی پچھلی شکایتوں کو بھول کر کہا سُنا معاف کروا لیا۔ اس پر بھی کہنے والوں کا بھن منہ کس نے بند کیا ہے محلے میں اُڑ گئی کہ یہ چھوٹی اماں اپنے نعلے کی کوٹھری میں سونے کی مہریں دفن کئے بیٹھی تھیں۔ یہ ان کو حاصل کرنے کی ترکیبیں تھیں۔ پر چھوبڑی بھاوج کے پاس خدا کا دیا خود کیا کچھ نہیں۔ جو وہ ایسے ایسے کمینے خیالات دل میں لائیں۔ اور اصلیت یہ ہے کہ چھوٹی اماں کی وہ سونے کی مہروں والی جھجری جس پر وہ عمر بھر مایا کا سانپ بنی بیٹھی رہیں۔ اوت کے مال سے بھی بدتر ثابت ہوئی۔ لڑکوں نے لے کر سارا پیسہ دو سال کے اندر اُڑا دیا۔ بلکہ بُوا مٹن تو یقین محکم کے ساتھ کہتی تھیں کہ چھوٹی اماں اور بڑی بھاوج کی لڑائی کروانے میں زیادہ ہاتھ چھمّو بیگم کا ہے۔ حرّافہ ادھر کی ادھر لگاتی تھی۔ اور پھر سال بھر سال منبر پر مولون بن کر چڑھ بیٹھتی ہے چڑیل۔

رونا بہر حال فرض تھا۔ خواہ چھمّو بیگم جیسی کُٹنی ہی بیان کیوں نہ پڑھے۔ لہٰذا بُوا مٹن دیوار کے سہارے بیٹھی بڑے مشہدی رومال سے منہ ڈھانپے شائستگی سے سسکیاں بھر رہی ہیں۔ لڑکیاں دہلیز پر بیٹھی اونگھ رہی تھیں اور منتظر تھیں کہ کب حدیث ختم ہو اور نوحہ خوانی کے

باری آئے۔

نوحے پڑھنے میں بڑی بھاوج کی لڑکی کشوری کو ملکہ حاصل تھا۔ ہاتھ آئے تھے کیا کیا گل زہرا کو فدائی —— نوماؤں نے دیکھی درِ خیمہ سے لڑائی —— اڑے لڑتے ہوئے گرتے ہوئے مرتے ہوئے دیکھا —— اور جانے کون کون سے سارے جدید نوحے۔ جی ہاں۔ ایسی پاٹ دار آواز میں آخری بند اُٹھاتی کہ کھیم کے گھر تک آواز پہنچ جاتی تھی۔

نوحوں کی طرزیں نکالنا لڑکیوں کا خاص مشغلہ تھا۔ جہاں کوئی چلتا چلتا لیکن غمگین سی دھن کا ریکارڈ سُنا جھٹ ذرا سی تبدیلی کر کے نجم الملت کے کسی نوحے پر اس دھن کو چپکا دیا۔ طلعت آرا اس معاملے میں بڑی رجعت پسند واقع ہوئی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ بھئی یہ غلط بات ہے۔ یہ کیا ساتویں رات کو معلوم کہ کانن بالا کا ریکارڈ بج رہا ہے۔ توبہ توبہ۔ مگر کشوری کس کی سنتی تھی۔ ویسے بھی وہ بڑی آزاد خیال روشن دماغ تھی۔ ہائی اسکول تو اس نے پاس کر لیا تھا۔ وہ تو لکھنؤ جا کر گئے ہاتھوں انٹر اور بی۔ اے بھی کر لے۔ لیکن چھوٹی امّاں جب مرتے وقت بڑی بھاوج سے صلح صفائی کرنے پر تلیں تو یہاں تک طے کر گئیں، کہ ان کے بڑے لڑکے میاں اعزاز سے اس کا بیاہ بھی کر دیا جائے۔

اب یہاں سے مسلم سوشل پکچر بننا شروع ہوئی۔ کشوری کہاں ایک تیز لڑکی۔ سارے نٹنگ کے نمونے اس کو آتے۔ جہاں پر وہ باغ میں کوئی نیا نمونہ سوئٹر کا کسی کو پہنے دیکھ پاتی گھر آ کر فوراً تیار۔ افسانے پڑھنے کی

وہ شوقین۔ فیاض علی کی انور و شمیم سے لے کر کرشن چندر کی "نظارے" اور حجاب امتیاز علی کی "ظالم محبت" تک اس کی الماری میں موجود۔ سنیما بھی جب موقع ملتا ضرور دیکھ لیتی۔ میاں اعزاز ایک تو یہ کہ خلصے مولوی آدمی تھے۔ پی سی ایس میں آگئے تھے۔ کیننگ کالج سے ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل بی کر رکھا تھا۔ لیکن اس کے روادار نہیں تھے کہ گھر کی لڑکیاں ذرا کی ذرا نمائش ہی میں ہو آئیں۔ خود بڑی دون کی لیتے تھے کہ مس سکسینہ سے یونین یونین میں یوں بحث چلی اور مس صدیقی کے یہاں یوں چار پر گیا۔ لیکن اپنے کنبے کی لڑکیوں کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ لڑکیاں جہاں گھر سے باہر نکلیں میاں زمانہ خراب ہے۔ کسی کو بدنام ہوتے کیا دیر لگتی ہے۔

بڑی بھاوج نے، لطیفہ یہ تھا کہ کشوری کے لئے بڑی منتیں مرادیں مان رکھی تھیں عاشورہ کے روز جب ذوالجناح اندر لایا جاتا تو جلیبی کھلانے کے بعد اس کے کان سے منہ لگا کر ساری بیبیاں اور ساری لونڈیاں، باندیاں دعا مانگتیں کہ یا مولا کشوری بٹیا کا نصیبہ اب کے سال ہی کھلے۔

اب یہ پوچھو کہ یہ میاں اعزاز کے پلے باندھنا نصیبے کا کھلنا سمجھا رہا تھا لیکن کشوری نے بھی طے کر لیا تھا کہ عین بیاہ کے موقع پر وہ انکار کر دے گی برات میں ایک ہڑبونگ مچ جائے گی۔ وہ جیسا کہ سوشل فلموں میں ہوتا ہے کہ عین وقت پر جب پھیرے پڑنے والے ہوں تو اصل ہیرو ہسپتال یا جیل سے چھوٹ کر پہنچ جاتا ہے اور گرج کر کہتا ہے کہ ٹھہر جاؤ یہ شادی نہیں ہو سکتی ——

(۵)

کشوری کے بابا سیّد جعفر عباس ڈپٹی کلکٹر تھے، لیکن دل کے بڑے پکّے قوم پرست مسلمان تھے۔ جب کانگریسی وزارت قائم ہوئی تو آپ بھی خوب خوشیاں منائیں۔ حافظ ابراہیم ضلع میں آئے تو آپ مارے محبت کے جا کے ان سے لپٹ گئے۔ جب جنگ چھڑی اور کانگریسی وزارت نے استعفیٰ دیا اور مسلم لیگ نے یوم نجات منایا تو کشوری کے بابا کو بڑا دکھ ہوا۔ اب وہ ریٹائر ہو چکے تھے اور چبوترے پر بیٹھے پیچوان لگائے سوچا کرتے کہ دنیا ہی بدلتی جا رہی ہے۔ لڑکے جن کو نوکری ہی نہ ملتی تھی۔ اب فوج میں چلے جا رہے تھے۔ اپنا اصغر عباس ہی اب لفٹنٹ تھا۔ مہنگائی شدید تھی۔ لیڈر جیل میں تھے۔ لیکن زندگی میں یک بیک ایک نیا رنگ آگیا تھا۔ حافظ ابراہیم کے —— موقع پر ضلع کے اردو اخباروں نے لکھا تھا:۔ کہاں گئی موٹر سرکاری بیچا کر سبزی ترکاری، یہ بھی دیکھا وہ بھی دیکھ —— کشوری کے بابا کو یہ سب پڑھ کر اور سُن کر صدمہ ہوتا۔ وہ بڑے پکّے مسلمان تھے۔ دراصل مسلمانوں کے معاشرے کا استحکام انہیں پُرانے مدرسۂ فکر ڈپٹی کلکٹروں کے دم قدم سے قائم تھا۔ پردے کے بڑے پابند۔ کیا مجال جو لڑکیاں بغیر قناتوں چادروں کے گھر سے قدم نکالیں (صوبے کے مشرقی ضلعوں میں بُرقعے کا رواج نہ تھا" باعزّت متوسط طبقے" کی مسلمان اور ہندو عورتیں چادریں اور

ڈلائیاں اوڑھ کر باہر نکلتی تھیں۔ ہندو عورتوں تو خیر گھونگھٹ کاڑھ کر سڑک پر سے گذر جاتیں تھیں۔ لیکن مسلمان بیبیوں کا دن دھاڑے باہر نکلنا سخت معیوب خیال کیا جاتا تھا)

اصغر عباس فوج میں رہ کر بالکل انگریز بنتا جا رہا تھا۔ اب کے سے جب وہ چھٹی پر گھر آیا آیا تو چند شرائط بابا کے سامنے رکھیں۔

(الف) وہ خود کنبے میں بیاہ نہ کرے گا۔

(ب) کشوری جب اس کے ساتھ رہنے کے لئے جبل پور جائے گی تو پردہ نہ کرے گی۔

(ج) ۱۶۰۱ز میاں سے بیاہ کا پروگرام منسوخ۔

(د) کشوری کو ایف اے کے لئے مسلم گرلز کالج لکھنؤ بھیجا جائیگا۔

بڑے بحث مباحثے کے بعد بابا اور بڑی بھاوج دونوں نے ان شرائط کے بیشتر نکات منظور کر لئے۔

ہندوستان کے مسلمان متوسط اور اوپری متوسط طبقے کا کوئی ہی خاندان ایسا ہو گا جس کی لڑکیوں نے کبھی نہ کبھی علیگڑھ گرلز کالج یا لکھنؤ مسلم اسکول میں نہ پڑھا ہو۔ بیشتر لڑکیوں کو اس بات پر فخر ہوتا ہے کہ انہوں نے چاہے چند روز ہی کے لئے کیوں نہیں، لیکن پڑھا مسلم اسکول میں ہے۔

بعینہٖ یہی احوال مہیلا ودیالہ لکھنؤ کا تھا۔ صوبے کے سارے ٹھوس ہندو متوسط طبقے کی بیشتر یاں اسی وِش ودیالہ کی ودیارتھی رہ چکی تھیں۔ سرکاری اور عیسائی اداروں کا ماحول مختلف تھا۔ وہاں انگریز کے اقبال

کی وجہ سے شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے۔

اب کی جولائی میں کھیم اور کشوری اکٹھی ہی جونپور سے ٹرین میں سوار ہوئیں اور لکھنؤ آن پہنچیں۔ چار باغ پر ماما کھیم کو اُتروانے کے لئے آ گئے تھے۔ اور کشوری کو پہنچانے کے لئے تو ماجد بھائی بچارے مردانہ ڈبہ میں موجود ہی تھے۔ اسٹیشن کی برساتی میں پہنچکر کھیم اور کشوری نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا اور روئیں اور کبھی کبھی ملنے کی کوشش کرنے کا وعدہ کیا اور تانگوں میں بیٹھ کر اپنی اپنی راہ چلی گئیں۔

(۶)

"کھیم وتی رائے زادہ سے میری ملاقات اتنے برسوں بعد منیٹ ہال سیڑھیوں پر ہوئی ـــــــ وہ چودھری سُلطان کے لیکچر کے اوپر جا رہی تھی۔ میں احتشام صاحب کی کلاس کے بعد پرشین تھیٹر سے اُتر رہی تھی ـــــــ کشوری نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ـــــــ اور پھر وہ خاموش ہو گئی ـــــــ اور کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی جہاں برف کے گالے چُپکے چُپکے نیچے گر رہے تھے

"کیا تم نے کبھی سوچا ہے" اس نے ساتھیوں کو مخاطب کیا ـــــــ

"کہ ہم جو چھ سو سال تک ایک دیوار کے سائے میں رہے، ایک مٹی سے ہماری اور اس کی تخلیق ہوئی تھی اس کے اور ہمارے گھر والوں کو اپنی مشترکہ کلچر پر ناز تھا۔ اور ایک قسم کا احساس برتری ـــــــ چار سال بعد جب اس وقت

کھیم نے مجھے دیکھا تو ایک لحظے کے لئے ذرا جھجکی پھر "ہلو کشوری" کہتی ہوئی آگے چلی گئی۔

"اور میں نے سوچا ٹھیک ہے۔ میں نے اور اس نے اسی دن کے لئے ساری تیاریاں کی تھیں۔ وہ مہیلا وڈیالہ کی لڑکی ہے۔ کانگریس پر یقین رکھتی ہے۔ میرے بابا بڑے نیشنلسٹ بنتے تھے۔ لیکن میں کٹر مسلم لیگی ہوں۔ یوم پاکستان کے جلسے کے موقع پر کھیم کے ساتھیوں نے ہمارے اوپر اینٹیں پھینکی تھیں۔ اکھنڈ ہندوستان ویک کے دنوں میں ہمارے رفقا نے ان کے پنڈال پر پکٹنگ کی تھی۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے یہی ٹھیک ہے اور بھائی زندگی نہ ہوئی شانتا رام کا فلم ہو گئی۔ بنو اچھے پڑوسی اور کرو بھائی چارہ۔ نہیں کرتے بھائی چارہ میاں زبردستی ہے تمہاری۔ یہی ایک مثال میری اور کھیم کی دیکھ لو جنم جنم کے پڑوسی تھے۔ اور کیا دوستی اور یگانگت کا عالم تھا۔ پر مجال ہم ان کے پچھ۔ ان کے چوکے کے قریب نہ پھٹک سکتے تھے۔ اور ہماری اماں کا یہ سلسلہ تھا کہ اگر ہندو کی دکان سے کوئی چیز آئی تو اسے فوراً حوض میں غوطہ دے کر پاک کیا جاتا تھا۔ ایک قوم اس طرح بنتی ہے؟ تقسیم کا مطالبہ ہند کی ساری تاریخ کا نہایت فطری اور نہایت منطقی نتیجہ ہے ——" کشوری چپ ہو گئی۔

آتشدان میں آگ دہک رہی تھی۔ کسی نے ایک انگارہ الاؤ میں سے نکال کر باہر گرا دیا۔ جہاں وہ چند لمحوں تک سلگتا رہا اور پھر بجھ گیا۔ نیچے سڑک پر کوئی بھکاری اکارڈین پر "موجوں کے اوپر" کا والز بجاتا ہوا گزر رہا تھا۔

"آج میں کمنوں کماری کے ہاں چار پر گئی تھی" ارملا نے کہا۔ "وہاں بہت سے لوگ آئے ہوئے تھے۔ ان سب سے میں نے کہا کہ ہمارے "جلسہ میلے" کو کامیاب بنانے کی کوشش کریں۔"

"کنول کماری" ___؟ کشوری نے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا ل کیا۔

"ہاں۔ ہمارے نئے فرسٹ سکریٹری کی بیوی۔ اور میں نے سوچا کہ قابل عورت ہے۔ اس سے میلے کے موقع پر ہندوستانی آرٹ پر کے ہاتھوں ایک تقریر بھی کروالیں۔ پام وت وغیرہ سبھی ہوں گے۔ بچاری نے وعدہ کر لیا۔"

سورج است ہو گیا ___ سورج است ہو گیا ___ دوسرے کمرے میں "میلے کے پروگرام کی ریہرسل کرتے ہوئے چند لڑکیوں نے ہر بندرناتھ چٹوپادھیا کا کورس یک لخت زور زور سے الاپنا شروع کر دیا۔

"میں نے بہت کوشش کر کے سوچا کہ میں جب یونیورسٹی میں اور لوگوں سے ملتی ہوں ___ اٹلی کے لوگ ہیں۔ برازیل کے۔ عراق اور مصر کے۔ میں ان سے اس طرح کیوں نہیں باتیں کرنا چاہتی۔ پھر ہمارے پروفیسر ہیں۔ ہمعصر فنون کی انجمن کے اراکین ہیں۔ انہوں نے ہمارے مسائل پر بڑی بڑی کتابیں لکھی ہیں۔ ہمارا بڑا دقیق مطالعہ کیا ہے۔ اخباروں میں وہ ہمارے متعلق ایڈیٹوریل لکھتے ہیں۔ دارالعلوم میں اور ریڈیو پر بحثیں کرتے ہیں

" کشوری نے کہا۔

چاروں اور آگ لگی ___ دل میں بھوک پیاس جگی ___ پگ پگ ہم گاتے ہیں ___ ہم گاتے ہم گاتے ___ لڑکیاں چلا رہی تھیں۔

"میرا جی چاہتا ہے۔ میں تم سے یہ سب باتیں کہوں۔ تم کو یہ سارا قصہ یہ سارا گورکھ دھندا سمجھاؤں"۔۔۔۔ اس نے ساتھیوں کو اداس آواز میں مخاطب کیا۔۔۔۔ تاکہ تم لوگ مجھے بھی ایک اور مضحکہ خیز کردار نہ سمجھو اور اس سارے پس منظر اس ساری کہانی کو اس فاصلے سے دیکھ کر اپنی نئی راہ کا تعین کرو۔

سڑک پر کیرل گانے والوں کی ٹولیاں گذرنی شروع ہو گئی تھیں۔

"کرسمس کا زمانہ بھی اختتام پر ہے" روزماری نے اظہار خیال کیا۔

ہاں، جونپور میں، میرے محلے میں، شاید تین چار بچے کچھ سوگوار پھسلم کے تعزیوں کے سائے میں بیٹھے اپنی قسمت کو روتے ہوں گے۔ نہیں شاید محرم کا زمانہ گذر گیا ہوگا۔ پرانے کیلنڈر بے کار ہو چکے ہوں گے۔ مجھے کچھ پتہ نہیں۔۔۔۔ کشوری نے دل میں کہا۔

"برفباری شدید ہو گئی ہے۔ پھر بہار آئے گی۔ کیا سارے زمانے، سارے موسم اتنے بے مصرف ہیں۔۔۔۔؟" روزماری نے اپنے آپ سے بات کی۔

نہیں۔۔۔۔ کشوری نے کہا۔

پگ پگ ہم گاتے چلیں۔۔۔۔ لڑکیوں کی آواز نے تکرار کی۔

(۷)

چارباغ اسٹیشن پر کیم کو آخری بار خدا حافظ کہنے کے بعد اب کشوری

کو دَم مارنے کی فرصت بھی کہاں تھی۔ پہلے مسلم اسکول۔ پھر چاند باغ پھر کیننگ کالج۔ زمانہ کہاں سے کہاں نکل گیا تھا۔ ہر ہنگامے میں کشوری موجود۔ مباحثے ہوئے ہیں۔ بیڈمنٹن ٹورنامنٹ ہیں۔ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن تھا۔ مصروفیات ہیں۔ ادھر ہندو اسٹوڈنٹس فیڈریشن تھا۔ مہا سبھائی طالبات کے جلسے جلوس تھے۔ جن میں کبھی کبھی کھیم رائے زادہ دور سے نظر آجاتی۔ طالب علموں کی دُنیا اچھی خاصی سیاسی اکھاڑہ بن گئی تھی۔ گھر پر واپس جاؤ تو وہی سیاست۔ کل کی تشویش، مستقبل کی فکر۔ مُلک کی تقسیم ہوگی۔ نہیں ہوگی۔ ہوگی۔ نہیں ہوگی۔

یونیورسیٹی کے لیکچرز کے دوران میں پروفیسروں سے جھڑپ ہو جاتی۔ سطحی طور پر ابھی دوستی اور بھائی چارہ قائم تھا۔ لیکن آخری "شوڈاؤن" کے لئے اسٹیج بالکل تیار تھا۔

ڈاکٹر آفتاب رائے ابھی تک ہسٹری ڈپارٹمنٹ میں موجود تھے۔ ایک روز ایک لیکچر کے دوران میں ان سے بھی کچھ تکرار ہوگئی۔ ایک ہندو طالب علم نے کہا، آزادی کا مطلب ڈاکٹر صاحب مکمل سوراج ہے۔ ہند کی دھرتی کو پھر سے شدھ کرنا ہے۔ ساری اُن قوموں کے اثر سے آزاد ہونا ہے جنہوں نے باہر سے آکر حملہ کیا۔ یہی تلک جی نے کہا تھا جی ہاں۔

اس پیریڈ میں شیواجی کے اوپر گفتگو ہو رہی تھی۔ لہذا خانہ جنگی ناگزیر تھی۔ شام تک ساری یونیورسٹی میں خبر پھیل گئی کہ ڈاکٹر آفتاب رائے کی کلاس میں ہندو مسلم فساد ہوگیا۔

اگلی صبح کشوری پورا جلوس بنا کر ڈاکٹر آفتاب رائے کے دفتر پہونچی۔

"ڈاکٹر صاحب ـــــ" اس نے نہایت رعب داب سے کہنا شروع کیا "کل جس طرح آپ نے حضرت اورنگ زیب علیہ رحمتہ کے متعلق اظہار خیال کیا۔ اس کے لئے معافی مانگئے۔ ورنہ ہم اسٹرائیک کر دیں گے۔ بلکہ کر دیا ہے اسٹرائیک ہم نے ـــــ آپ نے ہماری سخت دل آزاری کی ہے۔"

آفتاب رائے اچنبھے سے کشوری کو دیکھتے رہے ـــــ اری تو تو ڈپٹی جعفر عباس کی بٹیا ہے نا۔ اری باؤلی سی ـــــ وہ بے ساختہ کہنا چاہتے تھے۔ لیکن کشوری کے تیور دیکھ کر رک گئے۔ اور پہلو بدل کر سنجیدگی سے کھنکارے۔

"بات یہ ہے مس عباس ـــــ" انہوں نے کہنا شروع کیا "سیاست اور حصول تعلیم کے درمیان جو ـــــ"

"اجی ڈاکٹر صاحب بس اب رہنے دیجئے ـــــ" کسی نے آگے بڑھ کر کہا ـــــ "ہم خوب اس ڈھونگ کو جانتے ہیں۔ معافی مانگئے قبلہ ـــــ"

"ڈاکٹر صاحب میں نے کہا بنارس کیوں نہیں واپس چلے جاتے ـــــ؟" دوسری آواز آئی۔

"دیکھو میاں صاحبزادے ـــــ" آفتاب رائے نے رسان سے کہا۔ "معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تاریخ کے متعلق میرے چند نظریے اور اصول ہیں۔ میں اور تمہاری دل آزاری کروں گا؟ کیا باتیں کرتے ہو ـــــ؟"

"ہم کچھ نہیں جانتے" انہوں نے شور مچایا ـــــ "معافی مانگئے ورنہ

ہم کل اورنگ زیب ڈے منائیں گے۔"

"ضرور مناؤ ــــــ" آفتاب رائے نے یک لخت بے حد اُکتا کر کہا۔

"اور مکمل اسٹرائیک کردیں گے۔"

"ضرور کرو، ــــــ خدا مبارک کرے ــــــ" انہوں نے آہستہ سے کہا۔ اور چق اُٹھا کر اندر چلے گئے۔

"کٹر مہا سبھائی نکلا یہ بھی ــــــ" لڑکوں اور لڑکیوں نے آپس میں کہا اور برساتی سے نکل آئے۔

وہ رات ڈاکٹر آفتاب رائے نے شدید بے چینی سے کاٹی۔ حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ مسلمان طالب علموں کو اچھے نمبر نہ ملتے۔ ہندوؤں کو یونہی پاس کر دیا جاتا۔ ہوسٹلوں میں ہندو مسلمان اکٹھے رہتے تھے۔ لیکن جس ہوسٹل میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اس پر سبز پرچم لہرانے لگا تھا۔ اسکے جواب میں عین مغرب کی نماز کے وقت ہندو اکثریت والے ہوسٹلوں میں لاؤڈ اسپیکر نصب کر کے گراموفون بجایا جاتا۔

چند روز بعد آفتاب رائے کے سر میں جانے کیا سمائی کہ استعفٰے دیدیا اور غائب ہوئے۔ سارے میں ڈھنڈیا پڑ گئی۔ مگر ڈاکٹر آفتاب رائے نہ اب ملتے ہیں نہ تب لوگوں نے کہا ایک چول ہمیشہ سے ذرا ڈھیلی تھی۔ سنیاس لے لیا ہوگا۔ پھر تقسیم کا زمانہ آیا۔ اب کسے ہوش تھا کہ آفتاب رائے کی فکر کرتا۔ اپنی ہی جانوں کے لالے پڑے تھے۔

ملک آزاد ہوگیا۔ کھیم وتی کی شادی ہوگئی۔ کشوری کے گھر والے آدھے

پاکستان چلے گئے۔ اس کے بابا بہت بوڑھے ہو گئے تھے۔ آنکھوں سے کم سجھائی دیتا تھا۔ ایک ٹانگ پر فالج کا اثر تھا۔ دن بھر وہ جونپور میں اپنے گھر کی بیٹھک میں پلنگڑی پر لیٹے نادِ علی کا ورد کیا کرتے۔ اور پولیس ہر سمے ان کو تنگ کرتی۔ آپ کے بیٹے کا پاکستان سے آپ کے پاس کب خط آیا تھا؟ آپ نے کراچی میں کتنی جائداد خرید لی ہے؟ آپ وہ کب جا رہے ہیں؟ اصغر عباس ان کا اکلوتا لڑکا تھا اور اب پاکستانی فوج میں میجر تھا۔ نہ وہ ان کو خط لکھ سکتا تھا اور اگر مر جائیں تو مرتے وقت وہ اس کو دیکھ بھی نہ سکتے تھے۔ وہ تو کشوری کے لئے مصر تھا کہ وہ اس کے پاس راولپنڈی چلی آئے۔ لیکن ڈپٹی صاحب ہی نہ راضی ہوئے کہ اتنت سے بٹیا کو بھی نظروں سے اوجھل کر دیں۔ وہی کشوری تھی جس کی ایسے بسم اللہ کے گنبد میں پرورش ہوئی تھی۔ اور اب وقت نے ایسا پلٹا کھایا تھا کہ وہ جونپور کے گھر کی چار دیواری سے باہر مدتوں سے لکھنؤ کے کیلاش ہوسٹل میں رہ رہی تھی۔ ایم۔اے میں پڑھتی تھی۔ اور اس فکر میں تھی کہ بس ایم،اے کرتے ہی پاکستان پہنچ جائے گی۔ اور ملازمت کرے گی۔ ارے صاحب آزاد قوم کی لڑکیوں کے لئے ہزاروں باعزت راہیں کھلی ہیں۔ کالج میں پڑھایئے، نیشنل گارڈ میں بھرتی ہو جیئے۔ اخباروں میں مضمون لکھیے۔ ریڈیو پر بولئے۔ کوئی ایک چیز ہے جی ہاں۔ وہ دن گن رہی تھی کہ کب دو سال ختم ہوں اور کب وہ پاکستان اڑ چھو ہو۔۔۔ لیکن پھر بابا کی محبت آڑے آجاتی۔ دکھیا اتنے بوڑھے ہو گئے ہیں۔ آنکھوں سے سجھائی بھی نہیں

دیتا۔ کہتے ہیں بٹیا کچھ دن اور باپ کا ساتھ دے دو۔ جب میں مرجاؤں تو جہاں چاہنا جانا۔ چاہے پاکستان چاہے انگلینڈ اور امریکہ میں۔ میں اب تمہیں کسی بات سے روکتا تھوڑا ہی ہوں۔ بٹیا تم بھی چلی گئیں تو میں کیا کروں گا۔ محرم میں میرے لئے سوز خوانی کون کرے گا۔ میرے لئے لوکی کا حلوہ کون بنائے گا۔ پوت پہلے ہی مجھے چھوڑ کر چل دیا۔ پھر انکی آنکھیں بھر آتیں اور وہ اپنی سفید داڑھی کو جلدی جلدی پونچھتے ہوئے یا علی کہہ کر دیوار کی طرف کروٹ کر لیتے۔

بڑی بھاوج ان سے کہتیں —— دیوانے ہوئے ہو۔ بٹیا کو کب تلک اپنے پاس بٹھلاؤ گے۔ آج نہ گئی کل گئی۔ جانا تو اسے ہے ہی ایک دن یہاں اس کے لئے اب کون سے رشتے رکھے ہیں۔ سارے اچھے اچھے لڑکے ایکو ایک پاکستان چلے گئے۔ اور وہاں ان کی شادیاں بھی دھما دھب ہو رہی ہیں۔ یہ اصغر عباس کے پاس پہنچ جاتی تو وہ اسے بھی کوئی ڈھنگ کا لڑکا دیکھ کر ٹھکانے لگا دیتا۔ بڑی بھاوج کی اس شدید حقیقت پسندی سے کشوری کو اور زیادہ کوفت ہوتی۔ اور یہ ایک واقعہ تھا کہ اس نے پاکستان کے مسئلے پر اس زاویے سے کبھی غور ہی نہ کیا تھا۔ ویسے وہ سوچتی کہ بابا ہندوستان میں ایسا کیا کھونٹا گاڑ کر بیٹھے ہیں۔ اچھے خاصے ہوائی جہاز سے چلے چلتے مگر نہیں۔ اور یہ جو بابا کی ساری قوم پرستی تھی۔ سارا چوپود عمر بھر سے واقف ہے کہ بابا کتنے بڑے نیشنلسٹ تھے۔ تب بھی پولیس پیچھا نہیں چھوڑتی۔ سارے حکام اور پولیس والے جن کے سنگ جنم بھر کا ساتھ

اُٹھنا بیٹھنا تھا۔ وہی اب جان کے لاگو ہیں۔ کل ہی عجائب سنگھ چوہان نے جو عمر بھر سے روزانہ بابا کے پاس بیٹھ کر شعر و شاعری کرتا تھا، دوبارہ دوڑ بھجوا کر خانہ تلاشی لی۔ گویا ہم نے بندوقوں اور ہتھیاروں کا پورا میگزین دفن کر رکھا ہے۔ پھر اسے بابا پر ترس آجاتا۔ بچارے بابا!

اب ڈپٹی صاحب کی مالی حالت بھی ابتر ہوتی جارہی تھی۔ اصغر عباس پاکستان سے روپیہ نہ بھیج سکتا تھا جو تھوڑی بہت زمینیں تھیں ان پر ہندو کاشتکار قابض ہو گئے تھے اور دیوانی کی عدالت میں ڈپٹی صاحب کی فریاد کی شنوائی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ چھوٹی اماں مرحومہ کی مقدمہ بازیوں کے بعد جو کچھ زیور بچ رہا تھا۔ وہ بڑی بھاوج نے سمیٹ کر بہو کے حوالے کر دیا تھا جو وہ پاکستان لے گئی تھی۔ باقی روپیہ ڈپٹی صاحب کی پنشن کا کشوری کی تعلیم پر خرچ ہو رہا تھا۔ ان کے علاج کے لئے کہاں سے آتا اور فالج تو بوا ایسا روگ ہے کہ جان لے کر پیچھا چھوڑتا ہے۔ چنانچہ نوبت یہ پہنچی کہ چپکے چپکے بڑی بھاوج نے چھمّو بیگم کے ذریعے چند ایک گہنے جو بچ رہے تھے فروخت کروا دیئے۔ ویسے اس میں ایسی شرم کی تو کوئی وجہ نہ تھی۔ وہ جو مثل ہے کہ مرگ انبوہ جشنے دارد، ان گنت مسلمان گھرانے ایسے تھے جن کو ملازمتوں سے نکالا جا رہا تھا۔ یا جن کو نوکریاں نہ دی جاتی تھیں۔ وہ اپنے اپنے گہنے اور چاندی کے برتن بیچ بیچ کر گذارہ کر رہے تھے لیکن بڑی بھاوج ناک والی آدمی تھیں۔ اور ابھی ان کے بھلے وقتوں کو گذرے عرصہ ہی کتنا ہوا تھا کشوری کو یہ سب معلوم ہوا تو اس کی تو سٹّی گم ہو گئی۔ اس نے پاکستان جانے

کا خیال بالکل ترک کر دیا۔ اور سرگرمی سے ملازمت کی تلاش میں جُٹ گئی۔

اسے یقین کامل تھا کہ اب ایسا بھی کیا اندھیر ہے کہ اچھے سکنڈ ڈویژن والی اکنومکس کی ایم، اے کو کہیں جونیر لیکچرر شپ بھی نہ ملے گی۔ لیکن واقعہ یہ تھا کہ ایک جگہ تو اس سے صاف صاف کہہ دیا گیا کہ صاحب بات یہ ہے کہ جگہ تو خالی ہے۔ لیکن ہم پاکستان سے آئی ہوئی شرنارتھی لڑکیوں کو ترجیح دے رہے ہیں۔ اور ویسے ایمان کی یہ بات ہے کہ آپ مسلمان ہیں۔ ہمارے پاس آپ کی وفاداری کا کیا ثبوت ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ کسی خانگی مجبوری کی وجہ سے ہندوستان میں رکی ہوئی ہیں۔ پہلا موقع ملتے ہی آپ بھی پاکستان چلی جائیے گا۔ ہم موقع پرستی، مجبوری اور وفاداری کے مدارج الگ الگ پہچانتے ہیں۔

قدم قدم پر اس کو یہی سُننے کو ملتا۔ اور وہ گھوم پھر کر جونپور لوٹ آتی بڑی بھاوج نے اس سے کہا —— وہ تمہاری گوئیاں کیم کے ماموں آفتاب بہادر تھے۔ ان کو ہی جا کر پکڑو۔ وہ تو بڑے باا ثر آدمی ہیں۔ اور بڑے شریف۔ ضرور مدد کریں گے۔ اور کشوری کو خیال آیا۔ کس طرح وہ جلوس بنا کر ان کے پاس تک پہنچی تھی۔ اور ان کو سخت سُست سنائی تھیں۔ اس کے اگلے ہفتے ہی وہ غائب ہو گئے تھے۔

آفتاب رائے —— اب پتہ نہیں وہ کہاں ہوں گے۔ اُڑتی اڑتی سی سُنی تھی۔ کہ بمبئی میں حکومت کے خلاف تقریر کرنے کے جرم میں ان کو مرارجی ڈیسائی نے پکڑ کر احمد آباد جیل میں بند کر دیا تھا۔ جیل سے چھٹے تو کچھ اور گڑ بڑ

ہوئی اور غالباً ان کو ڈی پورٹ کر دیا گیا۔ اب شاید وہ روس میں ہیں۔
اور سمر قند ریڈیو سے اُردو میں خبریں سناتے ہیں۔ دوسری روایت تھی
کہ نہیں صاحب ڈاکٹر آفتاب رائے تو آج کل پنڈت نہرو کی بالکل مونچھ
کا بال بنے ہوئے ہیں اور ان کو ری پبلک بلیبی ڈورا میں ہند کا سفیر بنا کر
بھیجا جا رہا ہے۔ بہر حال ڈاکٹر صاحب تو عرصے سے گویا مستقل "زیر زمین" تھے۔
بچارے آفتاب رائے۔

آج چاند رات تھی۔ محلے میں نقارہ رکھا جا چکا تھا۔ مجلسیں اب بھی ہوتیں۔
لیکن وہ چہل پہل وہ رونق اور بے فکری تو کب کی خواب و خیال ہو چکی تھی۔
ڈیوڑھی میں ڈولیاں اُترنی شروع ہوئیں اور بیبیاں آ آ کر امام باڑے کے
دالان میں بیٹھنے لگیں۔ کشوری بے دلی سے دہلیز پر اپنی پرانی جگہ پر بیٹھی رہی۔
دالان کی چاندنی جس پر تل دھرنے کی جگہ نہ ہوتی تھی، اب چھدری چھدری نظر
آتی تھی۔ سارے خاندانوں میں سے دو دو تین تین افراد تو ضرور ہی ہجرت
کر گئے تھے۔ بڑی بھاوج بہت مشکل سے پاؤں گھسیٹتی اِدھر اُدھر چل پھر
رہی تھیں۔ اب وہ "اللّے تللّے" کہاں۔ ساری مہریاں اور کہاریں اور پاسنیں
ایک ایک کر کے چھوڑ کر چل دیں۔ بس نگوڑی ممولہ رہ گئی تھی، سو اس کی آواز
کو بھی پالا مار گیا تھا۔ لیکن چھمّو بیگم کو آتا دیکھ کر وہ پھر للکاری —— آ گئیں
چھمّو بیگم —— آؤ جم جم آؤ ——
چھمّو بیگم چُپ چاپ آن کر منبر کے پاس کھڑی ہو گئیں۔ زیارت پڑھ کے

تعزیوں کو جھک کر سلام کرنے اور کپٹیوں پر انگلیاں چٹخا کر جناب علی اصغر کے سبز جار جٹ کے گہوارے کی بلائیں لینے کے بعد انہوں نے علموں کو مخاطب کر کے آہستہ سے کہا ـــــ "مولا یہ میرا آخری محرم ہے۔ ارے اب تمہاری مجلسیں یہاں کیسے کروں گی" ـــــ اور یہ کہہ کر انہوں نے زور شور سے رونا شروع کر دیا۔

بُوا مدّن اپنی پرانی "دشمناگی" فراموش کر کے سرک کر اُن کے قریب آ بیٹھیں اور بولیں ـــــ "لو بوا غم حسین کو یاد کرو۔ اپنا غم ہلکا ہو جائے گا ـــــ مولا تو ہر جگہ ہیں۔ کیا پاکستان میں نہیں ہیں"

"ہاں ـــ ہاں ـــ" باقی بیبیوں نے آنسو خشک کرتے ہوئے تائید کی ـــــ مولاؑ کیا پاکستان میں نہیں ـــــ تم وہاں مولاؑ کی مجلسیں قائم کرنا۔

"لو بوا ـــــ ہم بھی چل دیئے پاکستان ـــ" جب محفل کی رقت ذرا کم ہوئی اور چھمو بیگم رات کا بیان ختم کر چکیں تو بوا مدّن نے اپنا اناؤنسمنٹ بھی کر ڈالا۔

"سچ کہو بوا مدّن ـــــ" بڑی بھاوج نے گوٹا پھانکتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں بیوی۔ ہم بھی چل دیئے ـــــ" بوا مدّن نے اعتراف کیا۔

"کیسے چل دیں ـــــ؟" بڑی بھاوج کو ایک طرح سے تو رشک ہی آیا۔ اچھے خاصے لوگ نکلتے جا رہے ہیں۔ سب تضیحتوں سے الگ۔ سارے دلدر دور ہو جائیں گے وہاں پہنچ کر ـــــ

"بس بڑی بھاوج لڑکا نہیں مانتا ـــــ وہاں سے ہر بار خط میں لکھتا

ہے کہ بس اماں آجاؤ ——— کوئی نگوڑی جگہ سکھر ہے، وہاں اس نے راشن کی ڈپو کھول رکھی ہے۔

"اچھا ——— ؟ شکر ہے، مولا سب کی بگڑی بنائیں۔ بڑی بھاوج نے کہا۔

"عاشور کی شب کی بیبی ——— بوا امّن نے جو حسب معمول عینک گھر بھول آئی تھیں، دوبارہ غلط مرثیہ شروع کیا۔ لیکن سب پر ایسی اُداسی اور اکتاہٹ طاری تھی کہ کسی نے ان کی تصحیح کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ بگن نے آواز ملائی چراغوں کی روشنی دالان میں مدھم سا زرد اُجالا بکھیرتی رہی۔ آنگن کے گیس کا ہنڈہ پیلا پڑتا جارہا تھا۔

اس تاریکی میں کشوری سیاہ دوپٹے سے سر ڈھانپے اپنی جگہ پر اکڑوں بیٹھی سامنے رات کے آسمان کو دیکھتی رہی۔

(۸)

کنول کماری جین نے مہمانوں کے جانے کے بعد نشست کے کمرے میں واپس آکر دریچوں کے پردے گرائے اور چائے کا سامان میزوں پر سے سمیٹنے لگی۔ مدراسی آیا ایک ہی تھی جسے وہ ہمراہ لیتی آئی تھی اور پردیس میں ملازموں کے فقدان پر اس نے ملٹری اڈوائزر بریگیڈیر کھنّہ کی بیوی سے بڑا رقت انگیز تبادلہ خیال کیا تھا۔ گھر کی صفائی اور بچے کی دیکھ بھال کے بعد جو اسے وقت ملتا اس میں وہ رائل اکیڈمی آف ڈریمیٹک آرٹ جاکر کوریوگرافی سیکھتی تھی۔ سر لارنس اور لیڈی اولیویز، اینتھنی ایسکویتھ، کرسٹو فرائی

ان سب سے اس کی بڑی گہری دوستی تھی۔ یہ سب مل کر گھنٹوں فن اداکاری جدید آرٹ اور ہندوستانی نیلے پر گفتگو کرتے۔ جین کے پاس ان سب بکھیڑوں کا وقت نہ تھا۔ ساڑھے آٹھ بجے رات کے تو وہ دفتر سے پٹ کر انڈیا ہاؤس سے لوٹتا۔ اور وہ تو صاف بات کہتا تھا کہ بھائی میں انٹلکچوئیل و نٹلکچوئیل نہیں ہوں۔ سیدھا سیدھا آدمی ہوں اور جس ڈھرے پر سن پینتیس سے چل رہا ہوں وہی میرے لئے ٹھیک ہے۔ انگریز کے زمانے میں وہ ملک کے طبقاتی قطب مینار کی سب سے اونچی سیڑھی پر پہونچ چکا تھا اور اب وہ اتنا اونچا تھا کہ بالکل بادلوں پر براجمان تھا۔ انگریز کے زمانے میں ڈریس سوٹ پہنتا۔ اب سفید چوڑی دار پاجامے اور سیاہ شروانی میں ملبوس سفارتی ضیافتوں کیا ہلکی پھلکی بنی تلی باتیں کرتا۔ خود کنول کیا کم معرکے کی ڈپلومیٹک واقف تھی۔ جہاں جاتی محفل جگمگا اٹھتی۔ وا۔ واہ مثلاً آج ہی کی پارٹی میں اس نے کوریا کی کرشنا مینن والی تجویز کے سلسلے میں "نیو اسٹیٹسمین اینڈ نیشن" کے ایڈیٹر کنگزلے مارٹن اور جدید شاعر لوئی مک دونوں کے چھکے چھڑا دیئے۔ سب کو قائل ہونا پڑا۔ چاند باغ کے اچھے پرانے سنہرے دنوں میں تو خیر وہ یونہی جھیٹ میں انٹلکچوئیل بن گئی تھی کہ یونیورسٹی کی زندگی کا ایک لازمی جزو تھا۔ پر یہ تو ان دنوں اس کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک روز وہ ان ساری جید بین الاقوامی نکیمرس ہستیوں سے یوں بھائی بھائی کے ساتھ ملا کرے گی جیسے وہ سب گاجر مولی ہیں۔

سویرا ہست ہو گیا ——— سویرا ہست ہو گیا ——— ارملا گنگناتی ہوئی

اندر آئی

"کنول دیدی ——— جاتے جاتے مجھے خیال آیا کہ ایک بار آپ کو پھر یاد دلا دوں کہ آپ کو مجلس میلے میں آنا ہے ———"

"ہاں ہاں بھئی ———" کنول نے جواب دیا۔ "اور وہ میری کتاب تو دیتی جاؤ ———"

"ارے ہائے ———" ارملا نے رک کر کہا۔ "وہ تو ڈاکٹر آفتاب رائے نے مجھ سے لے لی۔ وہ مجھے انڈیا آفس لائبریری سے نکلتے ہوئے مل گئے، چھین کر لے گئے، کہنے لگے کل دیدیں گے ———"

"ڈاکٹر — آفتاب ——— رائے ———؟" کنول نے دہرایا۔

"ہاں — کنول دیدی ———" ارملا نے اسی طرح لاپروائی سے بات جاری رکھی۔ "وہ تو دن بھر یونہی لائبریریوں میں گھسے رہتے ہیں۔ آجکل ایک نئی کتاب لکھ رہے ہیں۔ آج مہینوں کے بعد اتفاقاً نظر آ گئے۔ ان کا کوئی بھروسہ تھوڑا ہی ہے۔ لیکن کل وہ براڈ کاسٹنگ ہاؤس آ رہے ہیں۔ وہاں کتاب مجھے لوٹا دیں گے۔ اچھا گڈ نائٹ کنول دیدی ———"

"گڈ نائٹ ارملا"

"ارے ہاں" اس نے جاتے جاتے رک کر پھر کہا۔ "کل آپ رائل کمانڈ پرفورمنس میں جا رہی ہیں ———؟ آپ کو تو سر الفرڈ رچرڈسن نے خود ہی بلایا ہوگا ———"

"ارے نہیں بھئی ———" کنول نے پیشانی پر سے بال ہٹا کر تھکی تھکی

ہوئی آواز میں کہا (یہ بھی اس کا ایک پوز ہے) ایک دل جلی مسز اچاریہ جو سکنڈ سکریٹری کی بیوی تھی۔ مارے ضد کے اپنی ایک سہیلی سے کہا تھا۔ جانتی ہے بکھرے ہوئے بال اسکے اوپر اور زیادہ اچھے لگتے ہیں بہ ٹریل کہیں کی") نہیں بھئی ارملا۔ مجھے یہ پارٹیوں اور سفارتی معروفیتوں کا یہ سلسلہ بعض دفعہ بالکل بور کر دیتا ہے۔ اس سے کہیں پناہ نہیں ۔ ـــــــ " اچھا گڈ نائٹ "۔

" اچھی طرح سوؤ ـــــــ " کنول نے کہا۔ ارملا ہریندر ناتھ چٹوپادھیا کا کورس گنگناتی ہوئی نچلی منزل میں اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

انڈیا آفس لائبریری سے نکلتے ہوئے مل گئے ـــــــ ڈاکٹر آفتاب رائے مل گئے ـــــــ اجی ان کا کوئی بھروسہ تھوڑا ہی ہے۔ چھین کر لے گئے ـــــــ کہنے لگے کل دیدیں گے ـــــــ وہ صوفے پر بیٹھ گئی ـــــــ واستھی ـــــــ اس نے چلا کر آواز دی۔ کھانا گرم پر لگا دو ـــــــ اس نے ٹیلی ویژن کھولا۔ بکواس ہے۔ بند کر دیا۔ پھر اس نے ریڈیو لگایا۔ بکواس تھا۔ اسے بھی بند کر دیا۔ کیا پتہ اس سمے لکھنؤ ریڈیو پر ارچنا بنرجی گاتی ہو یو ہوڑی جھور نا ـــــــ نکر مکر جوئے بو جوئے ہو ـــــــ اور چاند باغ کی خاموش سڑکوں پر سے لڑکیاں لنیٹرن سروس کے بعد لوٹتی ہوں گی

میں نے کیا کیا تھا ـــــــ ؟ اس سے سوال کیا۔ کچھ نہیں۔ میں اب دس سال سے کنول کماری جین ہوں۔ یہ تو کچھ بات نہ بنی۔ بات کس طرح بنتی ہے کیوں نہیں بنتی ـــــــ سال گذرتے جا رہے ہیں۔ میں کنول کماری جس نے یہ سب دیکھا۔ ایک روز یونہی ختم ہو جاؤں گی۔ اور تب بہت اچھا ہوگا۔

ایسا نہ ہونا چاہئے تھا۔ پر ہو گیا

کنول ڈارلنگ ——— ثروت نے انگل اٹھا کر سخت صوفیانہ انداز میں اس سے کہا تھا ——— جن ڈھونڈھا تن پائیاں گہرے پانی پیٹھ۔

میں برہن ڈوبت ڈری رہی کنارے بیٹھ ——— ؟ کنول نے سوچا تھا۔

کنارا ابھی تو نہیں ہے۔

پانے کے کیا معنی ہیں ؟ کیا ملتا ہے ؟

باہر اندھیرا تھا۔ اور سردی۔ اور بیکراں خاموشی۔ میں زندہ ہوں۔

ارے بھائی آفتاب بہادر ——— اس نے غصے سے سر ہلا کر کہا ——— دل میں سوال کیا ——— تم کیوں چلے گئے تھے۔ میں نے تمہارا کچھ بگاڑا تھوڑا ہی تھا۔ تم اپنے آپ میں مگن رہتے۔ میں وہیں کہیں تمہاری زندگی کے تانے بانے میں کسی کونے میں آ کر چپکی بیٹھ جاتی اور بس تمہارے لئے لوریاں بنایا کرتی۔ تم اسی طرح رہتے اس میں تمہاری شکست نہ تھی، تمہاری تکمیل تھی میاں آفتاب بہادر ——— ؟

نیچے کیرل گانے والے ہیلینھ کی اور نکل گئے تھے۔

آفتاب بہادر ——— اب جو میں ہوں۔ اور جو تم ہو ——— کیا یہی بہت ٹھیک ہے ——— ؟

بہت زمانہ ہوا اس نے چاند باغ میں ایک لڑکی کو دیکھ کر جو آفتاب رائے کو بہت پہلے سے جانتی تھی۔ سوچا تھا کہ جنے آفتاب کی بیوی کیسی ہو گی (ایک بار اس کے لئے اس کی دوست ثروت نے ایک بوڑھے آدمی کی تصویر سامنے لا کر کہا تھا۔ آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

!! اور کمال یہ کہ چین میں اسی طرح کا چین۔ چین نکلا —) آفتاب کی بیوی۔ یہ فقرہ کتنا عجیب لگتا تھا۔ کوئی ہوگی چڑیل۔ آخر میں یہ سب کر کری کھاتے ہیں — ثروت نے اضافہ کیا تھا۔ خوبصورت تو ضرور ہوگی اور ٹینس کھیلتی ہوگی۔ جس کا آفتاب کو اتنا شوق ہے۔ لیکن فراٹے بھرنے اور ہوا میں اُڑنے والی لڑکیاں تو وہ سخت ناپسند کرتا تھا جس کو وہ پسند کرے گا وہ تو بہت ہی عمدہ ہوگی۔ بس بالکل مجموعہ خوبی۔ چندے آفتاب چندے مہتاب۔ جی ہاں۔ اور مجھ میں کیا برائی تھی —؟ اس نے طے کرنا چاہا۔ کہ آفتاب کا رویہ یہ تھا کہ اس پر کنول کماری پر یہ فرض اُترتی چاہیے تھی کہ یہ مہاپرش آسمان پر خاص اس کے لئے بھیجا گیا ہے لیکن یہ اس کی اپنی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ اس کنول کماری سے یا روزانہ آکر ملے یا کبھی نہ ملے۔ اُس سے طبلہ اور بے جے ونتی سُنے۔ پوریاں بنوا کر کھائے۔ پھر ایک روز اطمینان سے آگے چلا جائے۔ اور یہ کنول کماری بعد میں بیٹھ کر جھک مارتی رہے۔ اور کیا وہ اس کے پیچھے پیچھے ڈنڈا لے کر دوڑتی کہ اے میاں آفتاب بہادر ایک بات سنتے جاؤ — ان دنوں ثروت نے ایک اور لطیفہ ایجاد کیا۔ چیپنی کے بعد ایک روز اس نے "گینگ" کی باقی افراد سے کہا:۔ بھئی نمبر ۲۹ اے پی سین روڈ پر آج کل یہ سلسلہ ہے کہ اگر بھائی آفتاب چلتے چلتے رک کے دفعتاً کنولا رانی سے کہتے ہیں بھئی کنول مجھے تم سے ایک بات کہنی ہے تو ہماری کنولا رانی کو فوراً یہ دھیان ہوتا ہے کہ اب شاید یہ پرو پوز کرنے والا ہے وہ پر بات محض اتنی ہوتی ہے کہ بھئی ذرا ہیبل کو

فون کیو دے کہ آم خربہ تالائے۔ یا اسی قسم کی کوئی شدید اینٹی کلائمکس۔ ثروت اس قدر کمینی تھی —— وہ سارے مسخرے پن کے قصے یاد کرکے اب اُس نے دل میں ہنسنا چاہا۔ لیکن سردی بڑھتی گئی۔ اور بیکراں تنہائی۔ اور زندگی کے ازلی اور ابدی پچھتاووں کا ویرانہ۔ آفتاب بہادر تم کو پتہ ہے کہ میری کیسی جلاوطنی کی زندگی ہے۔ ذہنی طمانیت اور مکمل مسرّت کی دُنیا جو ہو سکتی تھی اس سے دیس نکالا جو مجھے ملا ہے اسے بھی اتنا عرصہ ہو گیا کہ اب میں اپنے متعلق کچھ سوچ بھی نہیں سکتی۔ اب میرے سامنے صرف رائل کمانڈ پرفورمنس ہیں۔ اور جین کے صبح کے ناشتے کی دیکھ بھال، اور یہ ہر دلعزیزی جو مجھ پر ٹھونس دی گئی ہے لیکن تم بھلا کیا سوچوگے (اس نے کہا تھا۔ ارے تم لوگ اسی کو پسند کرتی ہو جو ایک مخصوص معیار پر پورا اُترتا ہے۔ کیا اُلٹی منطق تھی۔ یعنی چت بھی تمہاری پٹ بھی۔ آخر اس ساری لفاظی اس ذہنی اور تصوراتی گورکھ دھندے سے تمہارا مطلب کیا نکلا۔ واہ واہ خنم آدمی کہیں کے۔

ثروت نے اس کی شادی کے موقع پر ایک اور سہیلی کے سامنے جامع و مانع اختصار کے ساتھ اس طرح تشریح کر دی تھی کہ قصّہ کو یوں مختصر کرتی ہوں اے عزیزہ۔ کنول کی ٹریجڈی یہ ہوئی کہ ساری عمر تو کوئی ان کی سمجھ میں نہ آیا۔ سب میں مین میکھ نکالتی رہیں اور مارے بد دماغی کے کسی کو خاطر میں نہ لادیں۔ اور جن بزرگوار کو آپ نے نہایت صدق دل سے پسند فرمایا وہ خود ہی ہری جھنڈی دکھلا گئے —— بس اب کیا ہے پیاری بہن۔ جب آنکھ کھلی تو

گاڑی نکل چکی تھی پٹڑی چمک رہی تھی — جی ہاں۔

ارے ثروت کروک کہیں کی۔

مگر سوال یہ تھا کہ ہر چیز کے متعلق اس مذاق اور خوش دلی کا رویہ کہاں تک گھسیٹا جاتا تھا۔ (لیکن اس کے علاوہ تم اور کر بھی کیا سکتی ہو۔ ثروت نے کہا تھا) زندگی نہ ہوئی اسٹیفن لیکاک کا مسخرہ پن ہو گئی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تمہارا مذاق کہاں ہوتا ہے اور سنجیدگی کہاں سے شروع ہوتی ہے (یا — VICE VERSA)

ڈاکٹر صاحب تو دن بھر لائبریریوں میں گھسے رہتے ہیں۔ اور آج کل ایک اور کتاب لکھ رہے ہیں۔ اسے ارملا نے مطلع کیا ہے۔ اب وہ کیا کر رہا ہے ڈاکٹر ڈی۔ بی کرچی کی طرح مہاگروبن چکا ہے۔ غالباً اس نے شادی کر لی ہوگی

یہاں پہنچ کر اسے عجیب و غریب اور انتہائی شدید تکلیف کا احساس ہوا (وہ کون ہوگی — کیسی ہوگی — آفتاب کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی کیسی نظر آتی ہوگی۔ آفتاب اس سے کہاں ملا ہوگا) یا اب تک وہ کنفرمڈ بیچلر بن چکا ہوگا (بہت سے لوگوں کے لئے اس میں سخت سخت گلیمر تھا — کیا بات ہے صاحب — ان ساری حماقتوں سے علیحدہ اور برگزیدہ — اپنی نہایت شخصی دنیا، اپنے مشغلے، اپنی کتابیں، موسیقی، بیتھوون کے کونسرٹ، چند دلچسپ سے گنے چنے دوست۔ اتوار کے روز دن بھر کسی کنٹری کلب کی لاؤنج میں بیٹھے ٹائمز پڑھ رہے ہیں۔ تیسرے پہر کو رائڈنگ کو چلے گئے۔ اور ٹینس کھیلا۔ اِدھر اُدھر خواتین سے بھی مل لئے۔ لیکن لڑکیوں کو ہمیشہ بڑے ترحم

کی نگاہوں سے دیکھا گویا ——— بیچاریاں ——— !! اور اپنا بے نیازی اور سرپرستی کا رویہ قائم رکھا ——— یہ سب ثروت نے ایک دفعہ ارشاد کیا تھا) اچھا بھئی آفتاب بہادر ——— تم کتابیں لکھتے رہو میں ان پر تھرڈ پروگرام میں ریویو کروں گی۔ راستہ اسی طرح طے ہوتا رہے گا۔

صبح ہوئی شام ہوئی ——— زندگی تمام ہوئی ——— زندگی تمام ہوئی ——

نچلی منزل میں ارملا ہریندر ناتھ چٹو پادھیا کا وہ کمبخت کورس آہستہ آہستہ الاپے جا رہی تھی۔

وہ دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ کہرہ اب کم ہو گیا تھا اور آسمان کا رنگ قرمزی تھا جس کے مقابل میں کیتھولک چرچ کے ہولناک گنبد کا سیاہ ہیولا نحوست سے اپنی جگہ پر قائم تھا۔

اونی لبادوں میں ملفوف، مشرقی یورپ سے بھاگے ہوئے لوگ، بھاری بھاری قدم اُٹھاتے ہاتھوں میں شمعیں لئے مڈنائٹ ماس کے لئے گرجا کی سمت بڑھ رہے تھے ———

صُبح ہوئی شام ہوئی
زندگی تمام ہوئی
زندگی تمام ہوئی
زندگی تمام ہوئی

(۹)

"جب مجھے ملازمت نہ ملی تو میں نے سمندر پار کے وظیفوں کے لئے ہاتھ پاؤں مارے۔ وہاں بھی وہی نقشہ تھا۔ لیکن انگریز پھر آڑے آیا۔ اور برٹش کونسل نے مجھے یہاں آنے کا وظیفہ دیدیا۔ اور جب میں نے روانہ ہونے کی خبر بابا کو سنائی تو وہ بالکل چپ ہو گئے اور اس کے بعد ایک لفظ منہ سے نہ بولے۔ اور ابھی میں راستے ہی میں تھی کہ جب مجھے اطلاع ملی کہ بابا مر گئے۔"

کشوری نے مدھم آواز میں بات ختم کی اور چھٹے سے آتشدان میں لکڑی کے کندوں کو ٹھیک کرنے میں منہمک ہو گئی۔

آج مڈنائٹ ماس مناتے جائیں گے۔ روزماری نے اپنے برش اور کینوس سمیٹتے ہوئے کہا۔ چلو ہم ویسٹ منسٹر کیتھیڈرل چلیں۔ جہاں ایک شام میں نے پیلے بالوں اور اداس چہرے والی ایک ہینگرین پناہ گزین لڑکی کو دیکھا تھا۔ وہ سر پر سیاہ اسکارف باندھے تسبیح ہاتھ میں لئے گھٹنوں سے ساکت اور منجمد بیٹھی تھی۔ اس کا یہ انداز کتنا قابل رحم تھی۔ میں نے قربانگاہ کے ستونوں کے پیچھے چھپ کر اس کی تصویر بنائی۔ میں نے اس تصویر کا نام "آزادی سے فرار" رکھا تھا۔ لیکن جب اسے نمائش میں رکھا جانے لگا تو ہمعصر فنون کی انجمن نے اس کا نام بدل کر "آزادی کا شکرانہ" کر دیا۔ آج کی رات میں وہاں اُمید اور نا اُمیدی کی کرب ناک کیفیتوں کے چند اور اسکیچ تیار کرونگی۔ کتنی کیفیتیں ہیں جنہیں الفاظ اور رنگوں کے روپ میں ڈھالا ہی نہیں

جاسکتا۔ جن کے اظہار سے ان کی بے وقعتی اور توہین ہوتی ہے۔۔۔۔ کشوری نے سوچا (یہی بات اپنے لئے کتنی بار کنول نے محسوس کی تھی۔ لیکن کوئی کچھ نہ جانتا تھا۔)

کیسی بے بسی ہے کہ سب اپنے اپنے دماغوں میں محصور رہے جانے پر مجبور ہیں۔

تم کو معلوم ہے کہ میں یکلخت اس طرح تم سب سے باتیں کیوں کہہ رہی ہوں۔ کشوری نے کہا۔

"سنتے ہیں کہ جب مدّتوں کے بچھڑے ہوئے دو جنے دوبارہ ملتے ہیں تو ساری پرانی یگانگت یاد آجاتی ہے۔ پُرانے دوستوں سے مل کر سبھی کو خوشی ہوتی ہے۔" اس نے بات آہستہ آہستہ جاری رکھی ــــــــ "لیکن پرانے "دشمن" سے مل کر مجھے کیسے مسرت ہوئی ــــــــ آج صبح مجھے بالکل اتفاقیہ کھیم وتی پھر سے نظر آگئی۔ مجھے پتہ نہ تھا کہ وہ یہاں پر ہے۔ وہ ایک دوکان سے نکل رہی تھی۔ "ارے کھیم ــــــ کھیما ــــــ میں چلا کر اس کی اور دوڑی۔ اس نے مجھے واقعی نہ پہچانا۔ وہ بہت موٹی ہو گئی تھی اور اس کے ساتھ غالباً اس کا شوہر تھا۔ "کھیما رانی تم ہم کا نا ہیں چنہیں ؟" میں نے بالکل بے ساختگی سے اپنی مادری زبان میں اس سے کہا۔ جو اس کی اور میری مادری زبان تھی ــــــ ہلو کشوری ــــــ اس نے کسی کسی گرمجوشی کا اظہار نہ کیا۔ نمستے اس کے شوہر نے مسکرا کر سلام کیا یہ میرے پتی ہیں۔ کھیم نے اس سرد مہری کے انداز میں بات کی۔ نمستے بھائی صاحب ــــــ! میں نے بیحد خوش دلی سے کہا

"تم تو پاکستانی ہو، تمہیں، تمنے نہ کہنا چاہئے" یہ کیھم نے بڑی طنز کے ساتھ کہا۔ میرے اوپر جانو کسی نے برف ڈال دی۔ میں نے کھسیانی ہنسی ہنس کر دوسری اور دیکھا اس کے شوہر نے جو بہت سمجھدار معلوم ہوتا تھا، فوراً بات سنبھالی اور بولا ——— "اچھا بہن جی ——— اس سمے تو ہم بہت جلدی میں ہیں۔ آپ کسی روز ہمارے یہاں آئیے۔ ہم یہیں ساؤتھ کینزنگٹن میں رہتے ہیں ———" "اچھا ضرور آؤں گی۔ بائی بائی کیھم" ——— میں نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔ اور آگے چلی گئی۔ میں نے اُسے یہ بھی نہ بتایا کہ میں پاکستانی نہیں ہوں۔ اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔

"میں اس وقت کوئی رقت انگیز تقریر نہ کروں گی۔ میں یہ نہ کہوں گی کہ رفیقو۔ انسان نے خودکشی کرلی۔ پرانی اقدار تباہ ہوگئیں۔ اپنے پرائے ہوگئے یہ سب پچھلے پانچ سال سے دُہراتے دہراتے تم لوگ اکتا نہیں گئے۔ یہ جو کچھ ہوا یہی ہوتا تھا۔ اور آپ تھیں کہ ایک نہایت رومینٹک تصویر لئے بیٹھی تھیں۔ گویا زندگی نہ ہوئی شانتارام کی فلم ہوگئی۔ میں نے اور کیھم نے جو کچھ کیا وہ ان سب باتوں کا نہایت منطقی نتیجہ تھا۔ اور باقی تم جو کہنا چاہتی ہو وہ جھک مارتی ہو۔ سمجھیں۔

" اس انداز سے میں نے اپنے آپ کو سمجھانا چاہا لیکن چلو روز ماری۔ اب ہم ممی تصویر بنائیں گے"۔ اس نے روز ماری کو مخاطب کیا۔ "تم اگر ہمارے اسکیچ تیار کرو تو تمہاری آرٹ کونسل اور ہم عصر فنون کی انجمن ان کے لئے کون سے عنوان منتخب کرے گی"۔

"ہم اپنے بدقسمت ملک کی وہ نوجوان نسل ہیں جو یورپ کی جنگ اور اپنے سیاسی انتشار کے زمانے میں پروان چڑھی۔ اپنی خانہ جنگی کے دوران اس کی ذہنی تربیت کی اور اب اس ہولناک "سرد لڑائی"، کے محاذ پر اسے اپنے اور دُنیا کے مستقبل کا تعین کرنا ہے۔

"ہم لوگ یونیورسٹی کی اونچی اونچی ڈگریاں حاصل کر رہے ہیں۔ تہذیبی میلے اور تہوار منعقد کرنے میں مصروف ہیں۔ بہے مارکیٹ کے مخصوص تھیٹروں میں اپنے بیلے کے پروگرام پیش کرتے ہیں۔ امن کانفرنسوں اور یوتھ فیسٹولوں میں شامل ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں سے واپس لوٹ کر کیا ہوگا۔

"تم نے کبھی خیال کیا ہے۔ میں کہاں جاؤں گی ـــ؟ میرا گھر اب کہاں ہے؟ کیا میں اور میری طرح دوسرے ہندوستانی مسلمان ایسے مضحکہ خیز اور قابلِ رحم کردار بننے کے مستحق تھے ـــ؟"

وہ خاموش ہو گئی۔ سب لوگ چپ چاپ بیٹھے آگ کے شعلوں کو دیکھتے رہے۔ سڑک کے دوسری طرف ایک مکان میں "وائٹ کرسمس" گائی جا رہی تھی۔

"شاید میں نے تمہیں بتایا تھا ـــ" ارملا نے نیچی آواز میں کہا "کہ آج دفتر سے واپسی میں ڈاکٹر آفتاب رائے مل گئے۔ میں نے اُن سے پوچھا۔ ڈاکٹر صاحب۔ میں نے تو سُنا تھا کہ ری پبلک لیبی ڈورا میں سفیر ہیں۔ تم نے غلط سُنا تھا ـــ! اُنہوں نے اطمینان سے مسکرا کر کہا۔ میں نے گھبرا کر ان کو دیکھا۔ تو کیا آپ بھی ـــ میں نے سوال کرنا چاہا۔ ہاں ـــ میں بھی ـــ

ـــ

اتنا کہہ کر وہ جلدی سے خدا حافظ کہتے ہوئے مجمع میں غائب ہو گئے۔ اور دوسرے لمحے اسٹیشن کے مہیب انڈر گراؤنڈ نے ان کو نگل لیا۔ ان کے ہاتھوں میں کتابیں تھیں اور وہ کسی سے بات کرنا نہ چاہتے تھے —— بجانے وہ کہاں رہتے ہیں۔ کیا کرتے ہیں۔ اتنا عرصہ انہوں نے کیسے گزارا۔ وطن واپس جانے کی اجازت انھیں کب ملے گی —— کیا ہوگا ——

دور گرجاؤں کے گھنٹے بجنے شروع ہو گئے تھے۔ وہ سب باہر سڑک پر آ گئے۔

ہماری غلطیوں کا سایہ ہمارے آگے آگے چلتا ہے اور رات ہمارے تعاقب میں ہے۔ انہوں نے سوچا —— لیکن ہم رات کی وادی کو تیزی سے عبور کر رہے ہیں۔

ہمارے چاروں طرف یہ لاکھوں کروڑوں انسانوں کا ہجوم یہ لوگ جو اپنی قسمتوں کو روتے ہیں۔ لیکن دیکھو یہ راستے۔ یہ جھیلیں، یہ باغات ہمارے منتظر ہیں۔ سناٹے میں صرف موت کے قدموں کی چاپ تھی۔ اجنبی موت یکلخت ہمارے سامنے آ گئی۔ لیکن ہم اسے چھوڑ کر ہنستے ہوئے آگے نکل جائیں گے سنو۔ ہمارے پاس یقین ہے اور کامل اعتماد جسے اس محبت نے تخلیق کیا ہے۔ جو غداری کے نام سے یاد کی جاتی ہے، یہ غداری محض یاسمین کے پھول کی آرزو ہے۔ وہ گرجا کی سمت بڑھتے رہے۔

سامنے راستے کی نیم تاریکی میں ایک ایلزبیتھن وضع کے میز ہاؤس میں دھندلی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ یہ ہندوستانی سفیر کے فرسٹ سکریٹری کا مکان

تھا۔ اس کے آگے پھر اندھیرا تھا۔ یہ کون دیوانی روح اپنی تنہائی سے گھبرا کر باہر نکل آئی ہے۔ انہوں نے سوال کیا۔ اس سے کہو یہ یہاں کیوں کھڑی ہے ان لیمپوں کے نیچے۔ گھاس کے ان راستوں پر۔ زمین کے ان پھولوں کے درمیان اسے کچھ نہ ملے گا۔ سنسان سیڑھیوں پر یہ کون لوگ نظر آرہے ہیں۔ ان سے کہو واپس جائیں اور صبح کا انتظار کریں۔

ہمارے اور ان کے خیالوں کے بھٹکنے ——؟

لیکن پھر گھنٹوں نے پکارا —— آؤ —— آج کی رات تمہارے وجود کے گناہ کا کفارہ ادا کیا جائے گا۔ میں تمہارے خدا کی آواز ہوں۔ اور تمہاری ہر تباہی میں شریک ہوں۔ اور ہر موت کا محافظ ہوں۔ اور اب پادریوں اور راہبوں کا جلوس آگے بڑھا۔ جو اپنے اپنے ملکوں سے جلا وطن ہو کر اس سے خداوند خدا کی تقدیس کرتے تھے۔ اور گرجا کی مرمریں سیڑھیوں پر سیاہ اسکارف سے سر ڈھانپے عورتیں اور بوڑھے اور جوان بڑے صبر سے بیٹھے تسبیحیں پھیر رہے تھے۔ اور ہولی کمیونین کے منتظر تھے۔

ایک راستہ یہیں پر آ کر ختم ہو جاتا ہے۔ پھر ایک دیوار ہے۔ لیکن ریشمی پردوں سے چھن چھن کر روشنی ادھر بھی پہنچ رہی ہے۔ گو بہت سے سیاہ پوش مریض دیوانے فلسفی اور بیمار سیاستدان راستہ روکے کھڑے ہیں۔

ہمیں تمہاری موت عزیز ہے۔ کیوں کہ تمہاری موت میں نجات ہے۔ ماس کے گھنٹوں نے کہا۔

ہماری ماں۔ چٹانوں کی بہن۔ سمندر کے روشنی ستارے ہمیں چپکے بیٹھنا

سکتا - یہ ہمارا عہد نامہ ہے۔

یہ ہمارا پرانا عہد نامہ تھا۔ ان کے خیالات تباہ ہو چکے۔ اب ان کے پاس کیا باقی رہا ہے ــــــ آرگن کے مدھم اور لرزہ خیز سروں کے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے وہ سب آہستہ سے اپنے راستے پر واپس آئے۔

"کنول رانی" ــــــ کسی نے اندھیرے میں یک لخت پہچان کر چپکے سے پکارا "یہاں آجاؤ"

اور ہمارے ساتھ ہو کر ــــــ ہو کر اس خوب صورت روشنی کو دیکھو جو آسمان پر پھیل رہی ہے۔ اب کسی پچھتاوے۔ کسی افسوس کا وقت نہیں ہے۔

"پرانے عہد نامے منسوخ ہوئے" کشوری نے آہستہ سے دہرایا۔ "ہم اس طرح زندہ نہ رہیں گے۔ ہم یوں اپنے آپ کو نہ مرنے دیں گے۔ ہماری جلاوطنی ختم ہو گی ــــــ ہمارے سامنے آج کی صبح ہے۔ مستقبل ہے۔ ہماری دنیا کی نئی تخلیق ہے"

لیکن کنول کماری ــــــ تم اب بھی روری ہو؟